June 2022

ماہنامہ

پیام عرفات

رائے بریلی

ملت اسلامیہ کی شان

''یہ وہ ملت ہے جو ڈوبتے ہوئے سفینہ کو ساحل تک پہنچا سکتی ہے اور کسی گرتے ہوئے معاشرہ کو جو زمین میں بالکل دھنس رہا اور دلدل میں پھنس رہا ہو اور جو خودکشی اور خود سوزی پر آمادہ ہے، بچا سکتی ہے، اس لیے کہ اس کے پاس وہ کتاب الٰہی ہے، اس کے پاس وہ اسوۂ نبوی ہے، اس کے پاس وہ ایمان موجود ہے جو اس کو خالص دولت پرست، اقتدار پرست اور مادہ پرست بننے سے روکتا ہے، یہ تنہا وہ ملت ہے جس کو اس زندگی کے بعد دوسری زندگی کا یقین ہے۔''

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

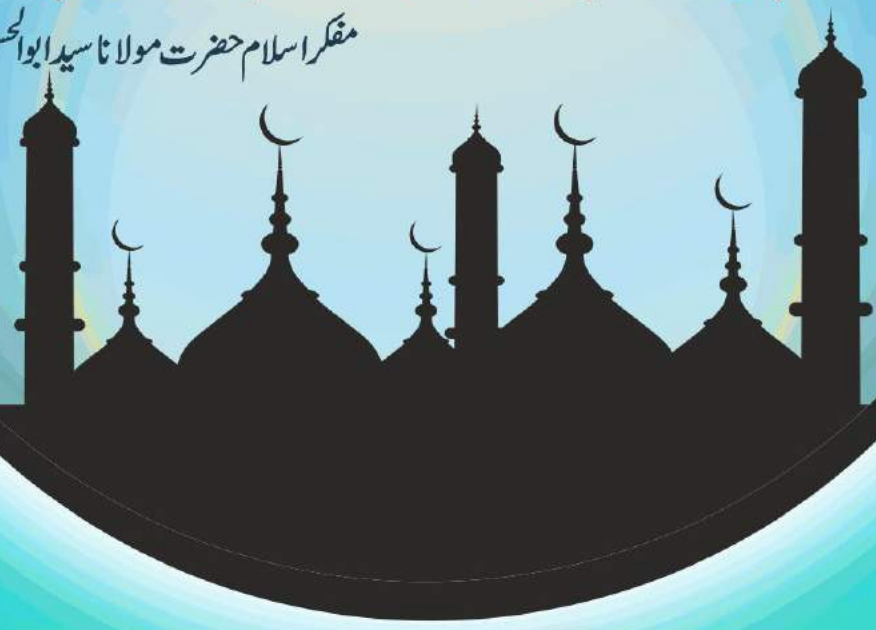

مرکز الإمام أبی الحسن الندوي
دارعرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

جذبہ ایمانی کی ضرورت نہ کہ مایوسی کی

مولانا ابوالکلام آزادؒ

''اب ہندوستان کی سیاست کا رخ بدل چکا ہے، اب یہ ہمارے اپنے دماغوں پر منحصر ہے کہ ہم کسی اچھے انداز فکر میں سوچتے ہیں یا نہیں؟

عزیزو! ہراس کا یہ موسم عارضی ہے، میں تم کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ ہم کو ہمارے سوا کوئی زیر نہیں کرسکتا، میں نے تمہیں ہمیشہ کہا اور آج پھر کہتا ہوں کہ تذبذب کا راستہ چھوڑ دو، شک سے ہاتھ اٹھالو اور بدعملی کو ترک کردو، یہ دیکھو مسجد کے مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کردیا ہے، ابھی کل کی بات ہے کہ یہیں جمنا کے کنارے تمہارے قافلوں نے وضو کیا تھا اور آج تم ہو کہ تمہیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔

عزیزو! اپنے اندر ایک تبدیلی پیدا کرو، جس طرح آج سے کچھ عرصہ پہلے تمہارا جوش وخروش بے جا تھا، اسی طرح آج تمہارا یہ خوف وہراس بھی بے جا ہے، مسلمان اور بزدلی یا مسلمان اور اشتعال ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتے، سچے مسلمان کو نہ تو کوئی طمع ہلاسکتی ہے اور نہ کوئی خوف ڈراسکتا ہے۔

عزیزو! تبدیلیوں کے ساتھ چلو، یہ نہ کہو کہ ہم اس تغیر کے لیے تیار نہ تھے، بلکہ اب تیار ہوجاؤ، ستارے ٹوٹ گئے، لیکن سورج تو چمک رہا ہے، اس سے کرنیں مانگ لو اور ان اندھیری راہوں میں بچھادو، جہاں اجالے کی سخت ضرورت ہے، میں تمہیں یہ نہیں کہتا کہ تم حاکمانہ اقتدار کی مدد سے وفاداری کا سرٹیفکٹ حاصل کرو اور کاسہ لیسی کی وہی زندگی اختیار کرو جو غیر ملکی حاکموں کے عہد میں تمہارا شعار رہا ہے، میں کہتا ہوں جو اجلے نقش ونگار تمہیں اس ہندوستان میں ماضی کی یادگار کے طور پر نظر آتے ہیں، وہ تمہارا ہی قافلہ لایا تھا، انہیں بھلاؤ نہیں، انہیں چھوڑو نہیں، ان کے وارث بن کر رہو اور سمجھ لو کہ اگر تم بھاگنے کے لیے تیار نہیں تو پھر تمہیں کوئی طاقت بھگا نہیں سکتی۔ آؤ عہد کریں کہ یہ ملک ہمارا ہے، ہم اس کے لیے ہیں اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے رہیں گے۔

آج زلزلوں سے ڈرتے ہو؟ کبھی تم خود ایک زلزلہ تھے، آج اندھیرے سے کانپتے ہو؟ کیا یاد نہیں رہا کہ تمہارا وجود ایک اجالا تھا، یہ بادلوں کی سیل کیا ہے کہ تم نے بھیگ جانے کے خدشہ سے اپنے پائنچے چڑھالیے ہیں، وہ تمہارے ہی اسلاف تھے جو سمندروں میں اتر گئے، پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا، بجلیاں آئیں تو ان پر مسکرادیے، بادل گرجے تو قہقہوں سے جواب دیا، صرصر اٹھی تو رخ پھیر دیا، آندھیاں آئیں تو ان سے کہا کہ تمہارا راستہ یہ نہیں ہے، یہ ایمان کی جان کنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے آج خود اپنے ہی گریبان کے تار بیچ رہے ہیں اور خدا سے اس درجہ غافل ہوگئے ہیں کہ جیسے اس پر کبھی ایمان ہی نہ تھا۔''

(آزاد کی تقریریں: ۱۶۹-۱۷۳)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو اور ہندی میں شائع ہونے والا

ماہنامہ

پیام عرفات

رائے بریلی

مرکز الامام أبی الحسن الندوی دارعرفات تکیہ کلاں رائے بریلی (یوپی)

جلد: ۱۴ ذوالقعدہ ۱۴۴۳ھ- جون ۲۰۲۲ء شمارہ: ۶

سرپرست: حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ (صدر، دارعرفات)

مجلس ادارت

بلال عبدالحی حسنی ندوی

مفتی راشد حسین ندوی

عبدالسبحان ناخدا ندوی

محمود حسن حسنی ندوی

محمد حسن ندوی

معاون ادارت

محمد نفیس خاں ندوی

محمد ارمغان بدایونی ندوی

عذاب الٰہی کو دستک نہ دیں!

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ:

"إِنَّ النَّاسَ إِذَا رَأَوُا الظَّالِمَ فَلَمْ يَأْخُذُوْا عَلٰى يَدَيْهِ أَوْشَكَ أَنْ يَعُمَّهُمُ اللّٰهُ بِعِقَابٍ مِنْهُ."

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

بلاشبہ جب لوگ ظالم کو ظلم کرتے ہوئے دیکھیں اور اسے نہ روکیں تو قریب ہے کہ اللہ کی طرف سے ان سب پر عذاب نازل ہوجائے۔

(سنن الترمذی: ۲۱۶۸)

پرنٹر پبلشر محمد حسن ندوی نے ایس، اے، آفسٹ پرنٹرس، مسجد کے پیچھے، پھاٹک عبداللہ خاں، سبزی منڈی، اسٹیشن روڈ، رائے بریلی سے طبع کرا کر دفتر "پیام عرفات" مرکز الامام أبی الحسن الندوي، دارِعرفات، تکیہ کلاں رائے بریلی سے شائع کیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

فی شمارہ: -/Rs.15 E-Mail: markazulimam@gmail.com سالانہ زرتعاون: -/Rs.150

Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi Samiti (Punjab National Bank) A/c No. 6127002100000339 (IFSC: PUNB0612700)

فہرس

دائرۂ کار اور قوتِ اختیار (اداریہ).....۳

.....بلال عبدالحی حسنی ندوی

دائرۂ کار اور قوتِ اختیار.....۴

.....حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

حضرت موسیٰ اور حضرت حضر علیہما السلام کا قصہ.....۶

.....حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ

علم مال کے تابع نہ ہو.....۸

.....حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ

غلبۂ اسلام کی کوششیں.....۹

.....مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

سچائی کیا ہے؟ (جاری).....۱۲

.....بلال عبدالحی حسنی ندوی

نکاح کے فضائل، شرعی حیثیت اور چند احکام.....۱۳

.....مفتی راشد حسین ندوی

ملت ابراہیمی یعنی دین محمدی ﷺ.....۱۶

.....عبدالسبحان ناخدا ندوی

طاقت کا نشہ.....۱۷

.....محمد ارمغان بدایونی ندوی

انسانیت کے بدلتے پیمانے.....۱۹

.....محمد نفیس خاں ندوی

اگرچہ لذت کام ودہن فراہم ہے

نتیجۂ فکر:- جناب عامر عثمانیؒ

اگرچہ لذت کام ودہن فراہم ہے
مگر دلوں پہ بڑی بے کسی کا عالم ہے

نہ پاسِ مہر ووفا ہے نہ ربط باہم ہے
نجوم طعنہ بلب ہیں یہ ابن آدم ہے

نہ خم ہوا تھا کسی در پہ جو خدا کے سوا
وہ سر خدا کے سوا آج ہر جگہ خم ہے

بہت ہے عشق کو اک التفات در پردہ
مگر ہوس کو نشاط دوام بھی کم ہے

زباں پہ عیش کے نغمے دلوں میں شورشِ غم
یہ زندگی تو نہیں زندگی کا ماتم ہے

میں چل پڑا ہوں اسی منزل حسیں کی طرف
کہ جس کی راہ میں کرب وبلا مسلم ہے

نہ اضطراب، نہ درد وخلش، نہ سوز وگداز
دل خراب ہمیں تیری موت کا غم ہے

یہ کس مقام پہ لایا ہے مجھ کو دل کہ جہاں
ہر ایک تازہ جراحت کا نام مرہم ہے

سکون منزل مقصود کے تمنائی!
یہ ہم سے پوچھ محبت جہادِ پیہم ہے

ہوا ہے جوشِ عمل اور بھی فزوں عامرؔ
خدا کا شکر کہ ہم سے زمانہ برہم ہے

بلال عبدالحی حسنی ندوی

دائرۂ اختیار اور قوتِ کار

دنیا اس وقت جس طرح تباہی کے راستہ پر ہے اور کیا یورپ وامریکہ اور کیا مراکز شرک وکفر، خود اسلامی دنیا اور مرکز اسلام میں اس وقت جس تیزی کے ساتھ اسلام سے دوری بڑھتی نظر آرہی ہے اور جس طرح وہاں کے ارباب اقتدار نے بڑی طاقتوں کے سامنے سپر ڈال دی ہے، وہ موجودہ دور کا سب سے بڑا المیہ ہے، اسلام کی حفاظت کا وعدہ اللہ کا ہے، وہ قیامت تک رہے گا، وہ نہ مٹ سکا ہے نہ مٹ سکے گا اور جو پوری طرح اس سے وابستگی اختیار کرے گا وہ بھی جہان میں رہے گا، بقول شاعر ؎

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
ادھر ڈوبے ادھر نکلے ادھر ڈوبے ادھر نکلے

دنیا میں جہاں بھی نظام شریعت سے بغاوت نظر آئے گی، اس کو دل سے برا سمجھنا، اس پر زبان کھولنا ایمان کی علامت ہے اور اگر اس کو کوئی دل سے بھی برا نہیں سمجھتا تو اس کے بعد ایمان بھی خطرہ میں ہے، حدیث میں آتا ہے کہ

"ولیس وراء ذلك من الایمان حبة خردل." (اس کے بعد تو رائی برابر ایمان باقی نہیں رہتا۔) (مسلم)

یہ اس امت کی خصوصیت ہے کہ اس کو دنیا کے احتساب کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور اقبال نے شیطان کی زبان سے جو کہا ہے وہ ایک حقیقت ہے:

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں　　ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات

احتساب کائنات کا یہ فریضہ اس امت کے علماء اور داعیوں کو ادا کرنا ہے، کمزوریوں کی نشاندہی کرنی ہے، حقائق سے باخبر کرنا ہے، چیلنجز سے آگاہ کرنا ہے، مسائل کا حل تلاش کرنا ہے اور امت کی رہبری کا کام انجام دینا ہے، لیکن یہ سب کچھ اپنے اپنے دائرۂ اختیار میں رہ کر کرنا ہے، امت کے اندر بڑا مرض یہ پیدا ہوگیا ہے کہ جو اپنے اختیار کا دائرہ ہے اس پر توجہ نہیں کی جاتی اور جو دوسروں کے دائرۂ اختیار کے کام ہیں، ساری صلاحیتیں ان پر صرف کی جاتی ہیں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ توجہ دہانی علماء کا کام ہے، احتساب دیں علماء کی ذمہ داری ہے، لیکن ایسا نہ ہو کہ ؎

سارے جہاں کا جائزہ اپنے جہاں سے بے خبر

احتساب کائنات کرنے والوں کی بڑی ذمہ داری احتساب نفس کی بھی ہے، جو کام ہم کر سکتے ہیں وہ ہم نے نہ کیا تو جو اختیار آج ہمیں حاصل ہے، کہیں وہ بھی چھن نہ جائے، اللہ نے جو جو دائرۂ اختیار ہمیں دیا ہے، اگر ہم نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا تو کہیں وہ دائرہ اور تنگ نہ ہو جائے۔ دنیا کے حالات ہمیں اس کی آگاہی دے رہے ہیں اور پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ آج جو تم کر سکتے ہو، وہ بھی تم نے نہ کیا تو آنے والا کل تمہارے لیے اور تنگی پیدا کرنے والا ہے۔

اپنے اپنے دائرۂ اختیار کو دیکھتے ہوئے ہم سب کو اپنی اپنی قوتِ کار کو بڑھانے کی ضرورت ہے، اپنی اس ایمانی طاقت اور عملی قوت سے ہم دائرہ کو اور وسیع کر سکتے ہیں، جو وسائل واسباب ممکن ہوں ان کو اختیار کر کے راستے کھولے جا سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ جانفشانی کرنے والوں کی محنت ضائع نہیں فرماتا، اللہ کے لیے اللہ کے راستہ میں جو قربانیاں دی جاتی ہیں وہ رنگ لاتی ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم جو کر سکتے ہیں، جو اللہ نے ہمارے دائرۂ اختیار میں رکھا ہے، ہم ادھر قدم بڑھائیں، اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال ہوگی، حدیث قدسی میں ہے:

"میں اپنے بندہ کے ساتھ اس کے گمان کے مطابق ہوں، لہٰذا جب وہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے یاد کرتا ہوں اور اگر وہ مجھے کسی مجلس میں یاد کرتا ہے تو میں اس کو اس سے بہتر مجلس میں یاد کرتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے ایک بالشت قریب ہوتا ہے تو میں اس سے ایک ہاتھ قریب ہو جاتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے ایک ہاتھ قریب ہوتا ہے تو میں اس سے دو ہاتھ قریب ہو جاتا ہوں اور اگر وہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کے پاس دوڑ کر آجاتا ہوں۔" (بخاری)

ملک کی تعمیر وترقی میں مسلمانوں کا کردار

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

''وقت ہمیں سب سے زیادہ جس چیز سے پرہیز کرنا چاہیے وہ انتشار، جماعتی انانیت، گروہی عصبیت اور جذبہ تفوق ہے، خدا ہم کو اس نازک ترین لمحہ پر ہمارے نفوس اور ہمارے دلوں کی بیماری اور بے راہ روی سے بچائے اور ہم کو ہمارے نفسوں کے حوالہ نہ کرے۔

ہندوستان میں مسلمان پانچ کروڑ کی تعداد میں ہیں اور ہندوستان کے نامذہبی دستور نے ان کو برابر کا شہری تسلیم کیا ہے اور ان کے تمام حقوق اور تحفظات کی ضمانت دی ہے، جو کسی آزاد جمہوری ملک میں، کسی آزاد اور باعزت شہری کو حاصل ہو سکتے ہیں، ان کے اس فیصلہ نے کہ وہ ہندوستان ہی میں رہیں گے اور ہندوستان ہی کو اپنا وطن سمجھتے ہیں، اخلاقی، سیاسی، قانونی اور دستوری حیثیت سے ان کو ان تمام حقوق وفوائد اور آزادیوں کا حق دار بنا دیا ہے، جو کسی ملک کے کسی بہتر سے بہتر شہری کو حاصل ہونی چاہئیں، وہ اپنی تعداد کے لحاظ سے دنیا کے بہت سے ملکوں کی پوری آبادی سے زیادہ اور وسیع دنیائے اسلام میں تیسرے نمبر پر ہیں، پاکستان اور انڈونیشیا کے کثیر التعداد اور تقریباً خالص مسلمان آبادی والے ممالک کے بعد انہی کا نام آتا ہے اور کہیں ایک جگہ مسلمانوں کی اتنی بڑی آبادی اور اتنی بڑی تعداد نہیں پائی جاتی، اس عددی حیثیت کے ماسوا وہ اپنی بہت سی فکری، ذہنی، علمی اور اخلاقی صلاحیتوں کے اعتبار سے عالم اسلام میں ممتاز مقام رکھتے ہیں اور بعض حیثیتوں سے وہ پورے عالم اسلام میں فائق ہیں، وہ بہت سے ذہنی وعلمی شعبوں میں آزاد مسلم ممالک کی بھی مدد ورہنمائی کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور ان میں اب بھی ان کی انفرادیت تسلیم کی جاتی ہے اور بہت سی اخلاقی، عملی، انتظامی اور ذہنی صلاحیتوں کے لحاظ سے وہ ہندوستان کی اکثریت اور تمام دوسرے فرقوں کے مقابلہ میں ممتاز ہیں، عقیدۂ توحید، اسلامی اخلاق، عدل ومساوات کے اسلامی اصول، وسعت قلب ووسعت نظر، کائنات، مخلوق خدا، انسانی برادری اور انسانی جان کی قدر وقیمت کے متعلق اس بنیادی نقطہ نظر کی بنا پر جو اسلام نے ان کو عطا کیا ہے، ان میں تعمیر کا جذبہ، تعاون اور بقائے باہم کی صلاحیت دوسروں سے زیادہ موجود ہے اور اس چیز نے ان کو زیادہ سے زیادہ بے آزار، انسان دوست، احسان شناس اور ملک کا وفادار بنا دیا ہے، انہوں نے اس ملک کی جنگ آزادی کا آغاز کیا اور اس میں قائدانہ حصہ لیا اور مجموعی حیثیت اور اپنی تعداد کے لحاظ سے سب سے زیادہ قربانیاں پیش کیں، وہ دنیا کی دوسری وسیع ترین برادری (ملت مسلمہ) کا ایک اہم اور تاریخی جزو ہیں جو ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے اور جو کم سے کم دو براعظموں (ایشیا اور افریقہ) میں اولین حیثیت رکھتی ہے اور دنیا کے ایک بڑے مرکز سیاست مشرق وسطی پر تنہا حاوی ہے اور ہندوستانی مسلمان ان تمام ممالک سے بہتر تعلقات پیدا کرنے کے لیے بہترین ذریعہ ثابت ہو سکتے ہیں، بلکہ ایشیا کی جو ہوش منداور حقیقت پسند قیادت خلوص اور سنجیدگی کے ساتھ اس برادری کا اعتماد حاصل کرے گی اور اپنے کو اس کا سچا دوست اور مخلص رفیق ثابت کرے گی، وہ مشرق کی سب سے بڑی طاقت بن جائے گی۔

ان سب بدیہی حقائق کا لازمی اور فطری تقاضا تھا کہ مسلمانوں کو اس ملک میں عملاً وہ سب کچھ حاصل ہو جو ان کو دستور کے اوراق پر اصولی اور قانونی طور پر حاصل ہے، یہاں کے ذہن سے اکثریت واقلیت کا تصور بھی محو ہو چکا ہو اور صرف ہندوستانی کا تصور باقی رہ گیا ہو، کسی مسلمان کے ساتھ کسی امتیازی سلوک کا تصور وامکان بھی ناجائز اور ایسا قومی وملکی جرم سمجھا جاتا ہو جو بڑی سے بڑی سزا کا مستحق

ہے، ایک ایک متنفس کی جان اور عزت عبادت گاہوں سے زیادہ مقدس اور تاج محل، قطب مینار، ایلورا اور اجنتا کی یادگاروں سے زیادہ ملک کا قیمتی اثاثہ اور قابل حفاظت خزانہ سمجھا جائے، ان میں سے کسی مفلوج، مریض، ناکارہ اور جاں بلب ہستی کی حفاظت ہزاروں ''مقدس'' جانوں' لاکھوں ''مقدس'' درختوں اور درجنوں ''مقدس'' دریاؤں کی تعظیم وحفاظت سے زیادہ ضروری سمجھی جاتی ہو اور جب کبھی ان دونوں میں ترجیح وانتخاب کا سوال پیش آئے تو ایک ملحد کے لیے بھی اس بارے میں کوئی تردد نہ ہو کہ انسان بالعموم اور ہندوستان کا شہری بالخصوص ان سب سے زیادہ قیمتی اور قابل حفاظت ہے، حصول آزادی کے بعد فرقہ وارانہ فسادات کا تخیل جو انگریزوں نے اپنی سیاسی وانتظامی مصلحتوں سے پیدا کیا تھا، اس طرح حافظہ سے محو اور زندگی سے ناپید ہوجانا چاہیے تھا کہ ہمارے ان بچوں اور نوجوانوں کے لیے جنہوں نے ۱۹۴۷ء کے بعد ہوش سنبھالا ہے ان کا سمجھنا ایسا ہی مشکل ہوجائے جیسا کہ تاریخ کے بعید از قیاس واقعات کا سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔

مذہبی وفرقہ وارانہ بنیاد پر کسی مسلمان کا قتل، اس کی بے عزتی اور اس پر دست درازی، ایک ایسا شرمناک اور ناقابل برداشت جرم سمجھا جائے جس پر حکومت کی ساری مشینری حرکت میں آجائے اور اس کے نتائج اتنے سنگین ہوں کہ پھر کسی ملک دشمن اور شریرالنفس کو اس تجربہ کی ہمت نہ پڑے، ملک کی بڑی سے بڑی ذمہ داری پر مسلمان پر اعتماد کیا جاسکے، فوج، پولیس اور نظام حکومت میں ان کو بڑی سے بڑی کلیدی جگہیں حاصل ہوں، ان کی زبان، ان کی مذہبی تعلیم، ان کا کلچر اور ان کا پرسنل لا، نہ صرف محفوظ ہو بلکہ ملک کا ایک قیمتی سرمایہ ہونے کی حیثیت سے اس کو نشو ونما وترقی کا پورا پورا موقع حاصل ہو، کسی لمحہ بھی یہ خیال ان کے قریب نہ آنے پائے کہ زبان، کلچر، پرسنل لا اور مذہبی تعلیم کی آزادی کے لحاظ سے انگریزی حکومت کا تاریک وشرمناک عہد ان کے لیے بہتر اور غنیمت تھا، کسی مسلمان کا کسی بڑے سے بڑے دماغی عدم توازن کے موقع پر اس بات کا تصور کرنا اور غلامی کے عہد کو یاد کرنا ہندوستان کی جمہوری حکومت کی سب سے بڑی ناکامی اور جنگ آزادی کے تقدس، اس کی آبرو اور ناموس پر دھبہ تصور کیا جائے اور جنگ آزادی کے سینکڑوں مخلص رہنماؤں اور لاکھوں بے لوث رضا کاروں کی روح کو اذیت پہنچانے کے مرادف سمجھا جائے اور اگر اس ملک کے کسی دور دراز گوشہ میں بھی کوئی ستم رسیدہ مسلمان آزادی کے عہد کا غلامی کے اس دور سے تقابل کرنے لگے اور اپنے ذہن کے کسی مخفی گوشہ میں بھی مذہبی آزادی کے لحاظ سے اس دور کو ترجیح دے تو اس کے لیے ہندوستانی رہنما گاندھی جی کی طرح برت رکھنا ضروری سمجھیں اور ہندوستان کے سب سے بڑے ذمہ دار انسان کا سر ندامت سے جھک جائے، اگر ہندوستان کے کسی گوشہ میں کسی مسلمان کی نکسیر بھی پھوٹ جائے تو اس کی تحقیقات اور اس کے اسباب کو معلوم کرنے کے لیے مرکزی حکومت سے لے کر ریاستی حکومت تک اس میں جنبش اور حرکت پیدا ہوجائے۔

ہندوستان میں جو افسوس ناک صورت حال قائم ہے، اس کا اخلاقی، قانونی، دستوری، سیاسی کسی صورت سے بھی کوئی جواز نہیں، یہ صورت حال ہندوستان کے لیے رسوا کن، اعتماد واتحاد کی فضا کے لیے سنگ گراں اور ہمہ جہتی، ترقی، خوشحالی اور استحکام نیز بین الاقوامی اعتماد کے لیے سخت مضر ہے، اس نے ملک کی بہت سی نوخیز اور پرجوش صلاحیتوں کو تعمیر کے بجائے تخریب پر لگا دیا ہے اور ملک میں شک وشبہ، بے اعتمادی، رنج وآزردگی، شکوہ وشکایت، غم وغصہ کی ایک ایسی فضا پیدا کردی ہے جس کا جد وجہد اور تنازع للبقا کے اس عہد میں کوئی جواز نہیں اور ہندوستان کے جیسے عظیم ملک کے لیے جو نہایت نازک جغرافیائی اور سیاسی نقطہ پر واقع ہے کوئی گنجائش نہیں۔ دوسری طرف پانچ چھ کروڑ کی عظیم اقلیت جو ہندوستان کی تعمیر وترقی کے کام میں نہایت اہم اور فیصلہ کن کردار ادا کرسکتی تھی، وہ اپنی جان ومال، عزت وناموس، زبان، کلچر اور تعلیم کے عدم تحفظ کے احساس سے غیر مطمئن، خائف اور ملول ہے اور اس کا اثر اس کی پوری زندگی، اس کے ولولہ کار، نشاط طبیعت، قوت عمل اور امنگوں اور توانائیوں پر پڑ رہا ہے، وہ روز بروز افسردہ، مایوس اور اپنے مستقبل کی طرف سے غیر مطمئن ہوتی جارہی ہے۔

حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام کا قصہ

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ

سورۂ کہف میں ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت خضر سے ملنے کا حکم دیا، جن کے پاس ان سے زیادہ علم تھا، چنانچہ سفر پر روانگی سے قبل حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے نوجوان ساتھی سے کہا کہ میں اس وقت تک مسلسل چلتا رہوں گا خواہ ایک دراز مدت تک ہی کیوں نہ چلنا پڑے، جب تک مجمع البحرین یعنی دو سمندروں کے ملنے کی جگہ پر نہ پہنچ جاؤں، یہی وہ جگہ تھی جہاں حضرت خضر سے ملاقات ہونا تھی، مجمع البحرین کے متعلق مفسرین کی مختلف آراء ہیں، کوئی کہتا ہے کہ دریائے سینا اور افریقہ کا دریا جہاں ملتے ہیں وہ جگہ مراد ہے، کوئی کہتا ہے کہ یہ جگہ دریائے دجلہ اور فرات کے پاس ہے، غرض کہ مختلف اندازے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی کہ اس کو متعین طور پر بیان کیا جائے، اس لیے کہ اس واقعہ سے اس کا کوئی اہم تعلق نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے رفیق جب مجمع البحرین پر پہنچے تو اپنی مچھلی بھول گئے اور مچھلی نے سمندر میں اپنا راستہ اختیار کرلیا، وہ سمندر میں اس طرح چلی گئی جس طرح مچھلیاں پانی میں بہتی ہیں، حالانکہ اس مچھلی پر مسالہ لگا ہوا تھا اور کھانے کے قابل تھی، لیکن وہ زندہ ہوئی اور اس میں جان پیدا ہوگئی اور پھر وہ پانی میں چلی گئی، بلاشبہ یہ ایک تعجب خیز واقعہ ہوا اور ایک معجزہ کی بات پیش آئی، اللہ نے اسی چیز کو ان دونوں حضرات کے ملنے کی ایک علامت بنایا تھا، چنانچہ جب وہ لوگ مجمع البحرین سے آگے بڑھ گئے تو ایک منزل پر پہنچ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رفیق سفر سے کہا: ہمیں سفر میں بہت تھکن ہوگئی ہے، ہمیں ہمارا کھانا لاؤ، جب حضرت موسیٰ نے کھانا مانگا تب اس نوجوان کو یاد آیا اور اس نے کہا کہ آپ کھانے کے لیے جو مچھلی مانگ رہے ہیں وہ تو زندہ ہوکر سمندر میں چلی گئی تھی اور اچانک عجیب طریقہ سے اچھل کر سمندر میں کود گئی تھی، مگر مجھے شیطان نے کچھ ایسا مشغول کردیا کہ آپ کو یہ بات بتانا ہی بھول گیا۔

حضرت موسیٰؑ کے رفیق نے بھولنے کی غلطی کو شیطان کی طرف منسوب کیا، جس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا شیطان کسی کو کوئی بات بھلانے پر قادر ہے؟ قرآن مجید میں شیطان کا کئی جگہ تذکرہ آیا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ شیطان بھلا سکتا ہے یا مصیبت میں مبتلا کرسکتا ہے، مثلاً: ﴿وَإِمَّا يُنسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرَى مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ﴾ (اور اگر شیطان آپ کو بھلا ہی دے تو یاد آنے کے بعد پھر ظالم لوگوں کے پاس مت بیٹھیں)

﴿وَقَالَ لِلَّذِي ظَنَّ أَنَّهُ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِي عِندَ رَبِّكَ فَأَنسَاهُ الشَّيْطَانُ ذِكْرَ رَبِّهِ﴾ (یوسف: ٤٢) (اور جس کے بارے میں یوسف کا خیال تھا کہ وہ ان دونوں میں بچ رہے گا اس سے انھوں نے کہا اپنے آقا کے سامنے میرا تذکرہ کرنا بس شیطان نے اس کو بھلا دیا کہ وہ اپنے آقا سے ذکر کرے)

﴿وَاذْكُرْ عَبْدَنَا أَيُّوبَ إِذْ نَادَى رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الشَّيْطَانُ بِنُصْبٍ وَعَذَابٍ﴾ (ص: ٤١) (اور ہمارے بندے ایوب کو بھی یاد کیجیے جب انھوں نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھے تو شیطان نے اذیت اور جنجال میں ڈال کر رکھا ہے)

اس کی تشریح یہ کی جاتی ہے کہ ہر بری چیز کی نسبت شیطان کی طرف ہوتی ہے، دراصل اللہ تبارک وتعالیٰ نے شیطان کو ایسا بنایا ہے کہ وہ ہوا کی طرح ہے، وہ چھوٹا بھی ہوسکتا ہے اور بڑا بھی، وہ انسان کے جسم میں سرایت کرجاتا ہے اور دل ودماغ میں بھی چلا جاتا ہے،

اللہ تعالیٰ نے اس کی ساخت ایسی رکھی ہے کہ وہ دماغ میں بھی گھس سکتا ہے، اسی لیے وہ آدمی کے خیالات میں شریک ہوجاتا ہے اور اس طرح وہ آدمی کے خیال کو بھلا دیتا ہے، گویا وہ آدمی کے ذہن کو اس طور پر متاثر کردیتا ہے کہ آدمی کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ شیطان نے ہمارا ذہن بھی متاثر کیا ہے اور وہ ذہن کو اس طور پر متاثر کرتا ہے کہ بعض مرتبہ کسی خواہش کو بڑھا دے گا، یا کسی تقاضے کو بڑھانے کا مشورہ دے گا، لیکن شیطان کا یہ مشورہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان اسے آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا اور نہ ہی یہ محسوس کرسکتا ہے کہ کوئی باہر کی طاقت ہم کو متوجہ کررہی ہے۔ ٹھیک اسی طرح نیک بندوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ وہ فرشتوں کے ذریعہ اچھے کاموں کا خیال دل میں ڈال دیتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب پتہ چلا کہ مچھلی نکل چکی ہے، تو کہا: ہم تو یہی جاننا چاہتے تھے کہ مچھلی سمندر میں کب گئی، اس لیے کہ وہی ہماری منزل تھی، چنانچہ پھر دونوں لوگ اپنے نشان قدم تلاش کرتے ہوئے پیچھے کی طرف واپس ہوئے اور اسی راستہ پر لوٹے جس سے گئے تھے۔

ارشاد الٰہی ہے کہ جب حضرت موسیٰ مقررہ مقام پر پہنچے تو وہاں انہوں نے ہمارے ایک بندے کو پایا، جس کو ہم نے اپنی طرف سے خاص طور پر رحم کا جذبہ عطا کیا تھا اور ہم نے اسے خاص علم سکھا دیا تھا۔ یہاں پر دو باتیں بیان ہوئیں، ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طبیعت ایسی بنائی تھی جو رحم دلی کی طبیعت تھی، جہاں انہوں نے دیکھا کہ کسی کو تکلیف ہے تو اس کو آرام پہنچانے کی کوشش کرنا، اگر کسی کو کوئی ضرورت ہے تو وہ ضرورت پوری کرنا، یوں بھی اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر یہ طبیعت بنائی ہے کہ اس میں رحم کا جذبہ ہوتا ہے، وہ ترس کھاتا ہے اور ہمدردی کرتا ہے، لیکن حضرت خضر کو رحم دلی کا جذبہ خاص طور پر عنایت کیا تھا اور اس جذبہ کے ساتھ دوسری چیز جو ان کو عطا کی تھی وہ خاص علم تھا، جس کے ذریعہ وہ ان حالات سے باخبر ہوجاتے تھے جن کو دوسرے لوگ نہیں دیکھ سکتے، اسی لیے وہ حالات دیکھ کر سمجھ جاتے تھے کہ کس جگہ مدد کی ضرورت ہے اور کس جگہ ہمدردی کی ضرورت ہے، لہٰذا جب بھی ایسی کوئی چیز ان کے علم میں آتی تھی تو وہ فوراً اس کو انجام دیتے تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کی خاص صلاحیت دی تھی، ان کے متعلق بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ نبی تھے اور بعض کہتے ہیں کہ نبی نہیں تھے، بلکہ اللہ کے خاص بندے تھے، گویا انہیں نبوت جیسا مقام حاصل تھا اور وہ اپنی مخصوص صلاحیتوں کی بنیاد پر اپنے اردگرد جو کچھ پیش آنے والا ہوتا تھا، اس کو محسوس کرلیتے تھے کہ اس میں کیا نتیجہ ہوگا؟

حضرت موسیٰؑ نے حضرت خضر سے مل کر درخواست کی کہ ہم آپ سے کچھ چیزیں سیکھنا چاہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو ''رشد'' یعنی سمجھ کی جو باتیں سکھائی ہیں، وہ باتیں ہم بھی سیکھنا چاہتے ہیں، حضرت خضر نے کہا: تم ہماری رفاقت برداشت نہیں کرسکتے ہو، اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ موسیٰ کا ذہن دوسرا ہے اور ان کا کام بھی دوسرا ہے، جب کہ ان (خضر) کا کام بالکل الگ ہے، چنانچہ ان کو ہر کام میں تعجب ہوگا اور یہ پریشان ہوں گے کہ ایسا کام کیوں ہورہا ہے؟ اسی لیے حضرت خضر نے کہا کہ تم ہمارے ساتھ برداشت سے کام نہیں لے سکتے ہو، ہم ایسے کام کریں گے جن سے آپ واقف نہیں ہیں اور آپ کو پتہ نہیں ہے کہ ان میں کیا مصلحت پوشیدہ ہے، لہٰذا آپ کو بہت تعجب ہوگا اور آپ ہر چیز پر ہمیں ٹوکیں گے، اس لیے ہماری رفاقت مشکل ہوگی، لیکن حضرت موسیٰ نے باصرار کہا کہ اللہ کی ذات سے امید ہے کہ ہم برداشت سے کام لیں گے اور آپ کی خلاف ورزی نہیں کریں گے، حضرت موسیٰ کے اس جواب پر حضرت خضر نے کہا: ٹھیک ہے اگر آپ میرے ساتھ چلنا چاہتے ہیں تو ہم جو کام کریں گے، آپ اس کے متعلق ہم سے کوئی سوال نہیں کریں گے، یہاں تک کہ ہم خود ہی آپ کو ان کاموں کی حقیقت بیان نہ کردیں، لہٰذا بہت برداشت سے کام لینا ہوگا پھر جب دونوں باہم رضامند ہوگئے تو سفر کے لیے روانہ ہوئے اور اس کے بعد تین عجیب وغریب واقعات پیش آئے۔ (جاری)

علم مال کے تابع نہ ہو

حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یونیورسٹیاں، کالجز اور علم کی موجودہ گرم بازاری کا نام علم ہے، یہ بات اپنی جگہ درست ہے، لیکن علم کے سلسلہ میں ایک بنیادی فرق سمجھنا ضروری ہے، علم اگر مال کے تابع ہو تو جہالت ہے اور مال اگر علم کے تابع ہو تو علم ہے، اب قرآن و حدیث کا علم ایسا ہے کہ وہ مال کے تابع ہو ہی نہیں سکتا، البتہ دنیاوی علم ایسا ہے کہ وہ کبھی مال کے تابع ہوتا ہے اور کبھی تابع نہیں ہوتا۔

افسوس کی بات ہے کہ بعض دینداروں نے علم دین کو بھی مال کے تابع بنا دیا ہے یا بنانے کی کوشش میں لگے ہیں، یہی وجہ ہے کہ علم کی جن برکتوں کا مظاہرہ ہونا چاہیے تھا، وہ ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور باقی ساری دنیا نے علم کو مال کا تابع بنا دیا۔

علم کو مال کا تابع بنانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم انسانوں کے لیے وبال ہو گیا اور ساری انسانیت پر کلنک کا ٹیکا لگ گیا، اب حال یہ ہے کہ جو شخص علم سیکھ رہا ہے وہ نفع پہنچانے کے بجائے انسانیت کو نقصان پہنچا رہا ہے، کتنے ڈاکٹر ایسے ہیں جن کے پاس علم ہے مگر ان کا علم مال کے تابع ہے، اس لیے وہ ڈاکٹر کے بجائے ڈاکو بنے ہوئے ہیں، وہ اپنے علم کے ذریعہ کسی کا گردہ نکال کر بیچ رہے ہیں اور کسی کی کڈنی فروخت کر رہے ہیں، کسی کے پاس راکٹ بنانے کا علم ہے، مگر وہ اسی کی بنیاد پر بے شمار لوگوں کو ہلاک کر رہا ہے اور زہریلی گیس بنا کر انسانوں کو تباہ کر رہا ہے، ظاہر بات ہے ایسا علم حقیقت میں علم نہیں بلکہ آخری درجہ کی جہالت ہے، جو لوگ اس علم کے ٹھیکیدار بنے خود کو سائنس داں اور فلسفی بتاتے ہیں، حقیقت میں وہ دنیا کے اتنے بڑے جاہل ہیں کہ شاید پوری تاریخ انسانی میں اتنے بڑے جاہل کبھی پیدا نہ ہوئے ہوں۔

علم اگر مال کے تابع نہ ہو تو اس کی قدر ہوتی ہے اور انسانوں کو نفع پہنچتا ہے، مثلاً: ایک شخص انجینئر اس لیے بنتا ہے تا کہ اگر آپ کے پاس مکان کے لیے تھوڑی سی جگہ ہے تو انجینئر اپنا دماغ لگا کر بتا سکے کہ آپ اس تھوڑی سی جگہ میں کیسے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، وہ اس لیے انجینئر نہیں بنتا کہ بڑے بڑے نقشے ہضم کر جائے اور پیسہ پر پیسہ کماتا رہے، پیسہ تو انسان کی ضرورت کے لیے ہوتا ہے اور انسان کا اصل کام نفع پہنچانا ہوتا ہے، اسی لیے علم مال سے اوپر ہونا چاہیے۔

علمی حلقوں میں یہ بات معروف ہے کہ جو چیز ضرورت کی ہوتی ہے اس کو بقدر ضرورت لینا چاہیے، اب اگر کوئی چیز ضرورت کی ہے اور ضرورت سے زیادہ آجائے تو پھر اس کا انجام کیا ہوگا؟ مثلاً: کھانے پینے اور پہننے کی چیزیں ضرورت کی ہیں، ایسے ہی جتنی بھی دیگر ضرورت کی چیزیں ہیں، اگر ان چیزوں میں توازن اختیار نہ کریں گے تو وہ چیزیں وبال جان بن جائیں گی، ٹھیک اسی طرح مال بھی ایک ضرورت کی چیز ہے، لہٰذا مال بقدر ضرورت ہی ہونا چاہیے، جتنی ضرورت پڑتی جائے اتنا مال آپ کو ملتا جائے۔

ہمارے بزرگوں نے مال کو ہمیشہ تابع رکھا، جتنی ضرورت ہوتی تھی وہ اتنا ہی لے لیتے تھے یا دوسروں کے لیے چھوڑ دیتے تھے، لیکن آج کل مال کی حرص کے سلسلہ میں معاملہ بالکل الٹا ہو چکا ہے، اس کے نتیجہ میں ہر کام وبال بنا ہوا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم لوگ اپنا قبلہ درست کریں، فی نفسہ کوئی بھی علم برا نہیں ہے، آدمی ڈاکٹر، انجینئر یا وکیل جو چاہے بنے، مگر اس کے اندر اسلامی جذبہ ہونا چاہیے اور اس کا علم مال کے تابع نہیں ہونا چاہیے، اگر یہ جذبہ ہوگا تو اس کا علم بھی انسانیت کے حق میں نفع بخش ہوگا، آج کل سماج میں جتنی بھی برائیاں پھیلی ہوئی نظر آرہی ہیں، وہ مال کی حد سے بڑھی ہوئی محبت ہی کا نتیجہ ہیں۔ علم کا مقصد اگر مال حاصل کرنا ہو تو جہالت ہے، مال کی حیثیت اگر پیر یا پازیب کی حد تک ہے تو ترقی کا زینہ ہے اور قوت کا پیش خیمہ ہے، لیکن اگر اس کو علم کی مسند پر بٹھا دیا جائے یا یوں کہیں کہ پیر کو سر پر رکھ دیا جائے تو آفت ہے اور موجودہ دور اس کی جیتی جاگتی مثال ہے۔

غلبۂ اسلام کی کوششیں

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ

قرآن کا بیان ہے کہ اللہ نے اسلام کا یہ مقام رکھا ہے کہ وہ دوسرے تمام افکار ومذاہب پر غالب رہے، مخالف اسلام طاقتیں اسلام کے رخ روشن پر کتنا بھی غبار ڈالنا چاہیں، اللہ اسلام کی روشنی کو مکمل کر کے رہیں گے، یہ یقیناً اللہ کا نوشتہ ہے، جو ماضی میں بھی پورا ہوتا رہا ہے اور مستقبل میں بھی انشاء اللہ پورا ہوتا رہے گا، لیکن کسی چیز کے غالب آنے کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، ایک اندرونی طاقت، دوسرے وہ ہتھیار جس کو وہ استعمال کرتا ہے، سوال یہ ہے کہ وہ طاقت کیا ہے جو اسلام کو غلبہ عطا کرتی ہے اور وہ ہتھیار کیا ہے جس کو اسلام کے غلبہ کے لیے استعمال کیا جانا چاہیے؟

اگر قرآن مجید کا مطالعہ کیا جائے تو اسلام کی سب سے بڑی طاقت اس کی فطرت اور عقل سے ہم آہنگ تعلیمات ہیں، جن کو قرآن مجید میں ''آیات بینات'' یعنی کھلی ہوئی دلیلوں سے تعبیر کیا گیا ہے، اسلام کے بنیادی افکار نہایت سائنٹفک اور منطقی ہیں، مثلاً: توحید اور آخرت کے تصور ہی کو لے لیجیے، وہ ایسے خدائے واحد کی طرف انسانیت کو بلاتا ہے جو بے حد طاقتور، مہربان اور باخبر ہے، وہ ان بتوں کی پرستش سے منع کرتا ہے جن کو انسان اپنے ہاتھوں سے بنا لیتا ہے اور بہت سی دفعہ اپنے ہاتھوں سے پانی میں بھی ڈال دیتا ہے، ایسی خود ساختہ چیزوں کو خدا کہنا خود اپنے بیٹے کو باپ اور اپنے غلام کو مالک کہنے کے مترادف ہے، اس لیے توحید کا عقیدہ سو فیصد عقل کے مطابق ہے، اسی طرح انسانی فطرت تقاضا کرتی ہے کہ انسان کو اس کے اچھے اور برے عمل کا بدلہ ملے، اسی لیے زمانہ قدیم سے ہر مہذب سماج میں عدالتی نظام قائم رہا ہے، قرآن نے اس سلسلہ میں آخرت کا تصور پیش کیا ہے، یہ تصور پوری طرح فطرت انسانی کے مطابق ہے، اس کے علاوہ یہ عقیدہ انسان کو اس وقت بھی ظلم سے بچاتا ہے، جب کوئی دیکھنے والی آنکھ اور ٹوکنے والی زبان موجود نہیں ہوتی، غرض کہ عقیدہ وایمان کا مسئلہ ہو یا عبادات کا، معاشرتی زندگی کے قوانین ہوں یا معاشی نظام سے متعلق اصول، یا بین ملکی وبین قومی تعلقات، ہر جگہ اسلامی تعلیمات عدل واعتدال پر مبنی، انسانی فطرت سے ہم آہنگ اور سماجی مصلحتوں سے مطابقت رکھنے والی ہیں، اسلام کی سب سے بڑی طاقت یہی ہے، اسی لیے رسول اللہ ﷺ کے عہد کے کفار ومشرکین اس دور کے اور اس دور کے یہود ونصاریٰ یا دوسری اسلام دشمن طاقتوں کو کبھی یہ ہمت نہیں پڑی کہ وہ اپنے مذہبی اور قومی افکار کا مقابلہ اسلامی تعلیمات سے کریں، بلکہ انہوں نے ہمیشہ ہارے ہوئے حریف کی طرح پروپیگنڈہ سے کام لیا، عہد نبوی ﷺ کے دشمنان اسلام پیغمبر اسلام ﷺ کے جادوگر اور شاعر ہونے کا پروپیگنڈہ کیا کرتے تھے صلیبی جنگوں کے درمیان عیسائیوں نے یہاں تک پروپیگنڈہ کیا کہ کعبۃ اللہ میں ایک بت ہے اور محمد ﷺ اس کی پرستش کرتے ہیں، صلیبی جنگوں کے بعد چونکہ اس طرح کے پروپیگنڈے خود عیسائی عوام کے نزدیک مضحکہ خیز اور ناقابل قبول ہوئے، اس لیے مستشرقین نے کچھ نئی افترا پردازیاں کیں اور موجودہ دور میں بلا دلیل اسلام کے شدت پسند اور دہشت گرد ہونے کا پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے اور صورت حال یہ ہے کہ عالم اسلام کی بزدلی، کم حوصلگی، حوس اقتدار، غیرت دینی اور حمیت ملی سے محرومی کی وجہ سے مغرب اس مقدمہ میں مدعی بھی ہے اور منصف بھی، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام کی اندرونی طاقت جو کل تھی وہی آج بھی ہے، مسلمانوں کی اپنے دین کی طرف رغبت اور مختلف ملکوں میں قبول اسلام کی طرف رجحان یہ اسی طاقت کا اثر ہے، ورنہ تو ذرائع ابلاغ نے اسلام کو اس درجہ بدنام کر رکھا ہے کہ کوئی شخص پلٹ کر بھی اسلام اور مسلمانوں کی طرف نہیں دیکھتا!

دوسرا سوال یہ ہے کہ وہ کون سا ہتھیار ہے جو غلبہ اسلام کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرسکتا ہے؟ آج کا دور صبح وشام ہتھیاروں کی تیاری کا دور ہے، ایسے آتشیں ہتھیار تیار ہو چکے ہیں کہ لمحہ بھر میں

ایک شہر تو کیا ایک ملک کو جلا کر خاکستر کردے، پانی کو تھامے ہوئے کسی ڈیم پر ایک بم گرادیا جائے اور پورا پورا شہر طوفان نوح کی طرح غرقاب ہوجائے، ایسے کیمیائی ہتھیاروں سے اسلحہ کا گودام بھرا ہوا ہے کہ لمحہ بھر میں آبادی کی آبادی چھلنی ہوجائے اور شہر کا شہر زندہ لاشوں کا قبرستان بن جائے، آج مغرب سے مشرق تک ان خوں آشام ہتھیاروں کی نمائش ہورہی ہے اور نہ جانے کب تک انسان کشی کا یہ کھیل کھیلا جاتا رہے گا، لیکن اسلام کو کبھی ایسے ہتھیاروں سے غلبہ حاصل نہیں ہوا، جب مکہ کے افق سے ایمان کا سورج طلوع ہوا، اس روشنی کا سرچشمہ صرف ایک ہستی تھی، پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی ہستی، پھر اس قافلہ میں کچھ خوش نصیب شامل ہوتے گئے، لیکن ہجرت تک یہ ایک نہایت کم تعداد اقلیت تھی، پھر مدنی زندگی کے ابتدائی پانچ سال اس طرح گذرے کہ بعض صحابہ جب سوتے تھے تو اپنے بستر میں تلوار رکھ کر سوتے تھے کہ مبادا دشمن حملہ آور ہوجائیں، قرآن مجید نے مسلمانوں کی صورت حال کا یہ نقشہ کھینچا ہے کہ وہ خوف زدہ رہتے تھے کہ کہیں انہیں اچک نہ لیا جائے، اس لیے یہ حقیقت ہے کہ اسلام کو کہیں بھی اپنی سربلندی اور غلبہ وظہور کے لیے ہلاکت خیز ہتھیاروں کی ضرورت نہیں پڑی، دنیا کے جس خطے میں مسلمان پہنچے کم وبیش ان کی یہی صورت حال رہی، وہ ایک مختصر سے قافلہ کی صورت میں پہنچے اور دیکھتے دیکھتے وہ اس ملک پر ابر رحمت بن کر چھا گئے۔

یہ کون سا ہتھیار تھا اور اس کو کس کارخانہ میں ڈھالا گیا تھا؟ یہ ہتھیار دعوت دین کا تھا، جسے حسن اخلاق سے صیقل کیا جاتا تھا، یہ ہتھیار زمینوں کو نہیں دلوں کو فتح کرتا تھا، یہ ملکوں کا نہیں دماغوں کا خریدار تھا، اس کا تخت اقتدار خاک وسنگ کی زمین سے پہلے قلب ونظر کی زمین پر بچھا کرتا تھا، مردوں اور عورتوں کو قیدی نہیں بناتا تھا، بلکہ محبت کا سودا گر تھا اور دل ونگاہ کو اپنا اسیر بنالیتا تھا، اسی ہتھیار سے اسلام نے جزیرۃ العرب کو فتح کیا تھا، ہجرت کے آٹھویں سال جب آپ ﷺ مکہ میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ کے ساتھ صرف دس ہزار جانثار تھے، مکہ کو خون بہا کر فتح نہیں کیا گیا، بلکہ محبت کی سوغات بانٹ کر جیتا گیا، کسی کو اسلام لانے پر مجبور نہیں کیا گیا، لیکن پیغمبر اسلام ﷺ کے عفو ودرگزر اور انسانیت نوازی سے متاثر ہوکر قریب قریب پورا مکہ مسلمان ہوگیا، اس کے بعد مسلمانوں نے یکسو ہوکر دعوت اسلام کی طرف توجہ کی اور صرف دو سال کے بعد جب حجۃ الوداع کے موقع سے آپ ﷺ مکہ مکرمہ تشریف لائے تو تقریباً سوا لاکھ رفقاء آپ ﷺ کے ہم رکاب تھے، اسی طرح اسلام کی روشنی مشرق اور مغرب میں پھیلتی گئی، گھٹائیں چھٹتی گئیں اور ظلمت وکفر کی دبیز چادر اسلام کے رخ روشن کے سامنے تار تار ہوتی گئی، یہ سب کچھ اس طرح ہوا کہ نہ اسلام کے پیچھے تلوار تھی، نہ توپ وتفنگ، نہ جنگی جہاز تھے، نہ بم اور میزائل تھے، یہ صرف دعوت دین کا ہتھیار تھا، جس نے دشمنوں کے جسموں کو نہیں، دلوں کو جیت لیا۔

رسول ﷺ کی زبان مبارک سے کہلایا گیا کہ میرا اور میرے پیروکاروں کا اصل ہتھیار دعوت ہے، میرا طریق یہی ہے کہ اللہ کے بندوں کو اس کے مالک کی طرف اور کفر کی تاریکی سے ایمان کی روشنی کی طرف بلائیں اور میری یہ دعوت پورے شعور، گہرے فہم اور علمی بصیرت پر مبنی ہو، رسول ﷺ کو مکی زندگی میں مخالفین اسلام سے مقابلہ کا یہی گر بتایا گیا کہ آپ حکمت اور دردمندانہ نصیحت کے ساتھ خدا ناآشنا لوگوں کو اپنے پروردگار کی طرف بلائیں اور ان سے مذاکرہ بھی کریں اور اس مذاکرہ ومکالمہ میں صرف بہتر طریقہ کا استعمال کافی نہیں، بلکہ سب سے بہتر اور خوب تر طریقہ کار کو برتیں۔

اس کے برخلاف اگر امت دعوت کے کام کو چھوڑ دے چاہے وہ بظاہر کتنے ہی مظلوم ہوں، وہ پیغام حق کو نہ پہنچا کر انسانیت کے ساتھ ظلم کا ارتکاب کرنے والی ہے، امت اور قرآن مجید نے واضح اعلان کردیا ہے کہ ظالموں کو کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی، قرآن مجید نے صاف طور پر کہہ دیا ہے کہ اس امت کو بھیجا ہی گیا ہے اور اس کو بہترین امت کے مقام سے نوازا ہی گیا ہے، اس لیے کہ وہ بھلائی کا حکم دے اور برائی سے روکے، یہ اس امت کو برپا کرنے کا مقصود

ہے، بات خدائی منصوبہ کا حصہ ہے کہ جو کام پچھلے پیغمبروں سے لیا گیا ہے، وہی کام اس امت سے لیا جائے، اب اگر کوئی چیز اپنے اصل مقصد کے لیے کارگر نہ رہے تو وہ کیا باقی رہنے اور عزت پانے کی مستحق ہے؟ انسان کو ماں باپ، بال بچے، شوہر اور بیوی سے کتنا پیار ہوتا ہے، لیکن جب وہ موت کے منھ میں چلے جاتے ہیں تو کوئی ان کو اپنے گھر میں نہیں رکھتا ہے، اس کی جگہ قبرستان ہوتی ہے، بلب اور ٹیوب لائٹ کو انسان اپنے دیوار کی زینت بناتا ہے اور اپنے سروں پر رکھتا ہے، لیکن اگر یہ خراب ہوجائیں اور روشنی دینا چھوڑ دیں تو پھر اس کی جگہ ڈسٹ بین ہوتی ہے، ملت اسلامیہ کی صورت حال اس وقت یہی ہے، ایسا لگتا ہے کہ قدرت نے اس کو ڈسٹ بین میں ڈال دیا ہے، جن کا کام اور جن کا نام عالم انسانی کے افق پر عزت وسربلندی کی علامت سمجھا جاتا تھا اور جن کی فتح وکامیابی کا غلغلہ مشرق سے مغرب تک تھا، وہ آج اس مقام پر ہیں کہ شاید رسوائی اور نامرادی میں کوئی قوم ان کی ہمسر نہ ہو۔

ہندوستان کے موجودہ حالات ہمارے لیے تازیانہ عبرت ہیں، ایک ہزار سال تک مسلمانوں نے یہاں اس طرح حکومت کی کہ کوئی طاقت ان کو چیلنج کرنے کی ہمت نہیں کرسکتی تھی، لیکن انہوں نے یہ پورا وقت اقتدار کے محل کو مضبوط کرنے اور بنانے سنوارنے میں صرف کردیا اور چند مشائخ ربانی اور ایک دو نیک دل بادشاہوں کے علاوہ کسی نے اشاعت اسلام کی طرف توجہ نہیں دی، یہاں تک کہ علماء کی بھی ایک بڑی تعداد مناظرہ بازیوں اور باہمی آویزشوں کے نشہ میں مست رہی، پھر برطانوی استعمار کا ایک کوڑا قدرت کی جانب سے لگایا گیا، جو کم وبیش دوسو سال ہم پر مسلط رہا، تقریباً اس دوسو سال کے عرصہ میں کچھ تو حالات کے تقاضے کے تحت اور کچھ طویل عرصہ سے بنے بنائے مزاج کے تحت دعوت اسلام کی طرف توجہ نہیں دی گئی، غالباً اس سے صرف سید احمد شہیدؒ کے بعض خلفاء کا استثناء ہے، جنہوں نے برادران وطن میں تبلیغ کی خدمت انجام دی، اب ملک کی آزادی کو ساٹھ سال سے زیادہ کا عرصہ گذر چکا ہے، عیسائی بھائیوں نے اس وقفہ میں عیسائیت کی تبلیغ واشاعت کی مہم چلائی اور اس عرصہ میں انہوں نے کئی ریاستوں کے نقشے بدل کر رکھ دیے، لیکن آہ اور صد آہ! ہماری غفلت کوشی اور خود فراموشی کہ ہم اب بھی بیدار نہیں ہوئے، یہاں تک کہ فرائض دین میں دعوت اسلام اس کا ذکر تک باقی نہیں رہا، جو مسلمانوں پر عائد ہونے والا سب سے پہلا فریضہ تھا اور جو اس کا مقصد وجود تھا۔

مسلمان اس ملک میں جس صورت حال سے دوچار ہیں، اس کا مستقل، مؤثر اور دیرپا حل یہی ہے کہ جیسے سیاست داں الیکشن کے موسم میں الیکشن کو اوڑھنا بچھونا بنالیتے ہیں، اسی طرح مسلمان اس کو اپنے لیے اوڑھنا بچھونا بنالیں، اپنے غیر مسلم پڑوسیوں سے باتیں کیجیے، مسلمان ڈاکٹر مریضوں کو اللہ کے دین کی طرف بلائے، تاجر ہے تو وہ گاہکوں کو دین حق سے روشناس کرائے، معالج ہو تو مریضوں کو اللہ کے دین کی طرف بلائے، افسر ہو تو اپنے ملازمین کے سامنے اسلام کی حقیقت کو واضح کرے، کسی بھی پیشہ سے کوئی متعلق ہو، ہم اپنے پیشہ تک دین اسلام کی بات پہنچائیں، سفر میں ہو تو ساتھیوں سے دینی گفتگو کرے، غرض کہ ہم محبت، حکمت، جذبہ خیر خواہی اور بے لوث خدمت کے سہارے برادران وطن کے دلوں تک پہنچیں اور اس فریضہ کو ادا کریں، جس کے لیے اللہ نے ہمیں نہ صرف انسان کی اس بستی میں بسایا ہے، بلکہ اپنے پیغمبر کا جانشین بنایا ہے، گذشتہ تقریباً دو دہائی سے خاص کر بابری مسجد کی شہادت کے سانحہ کے بعد سے مختلف تنظیمیں اور مختلف شخصیتوں نے دعوت کے کام کی طرف جو توجہ دی ہے، بحمد اللہ اس کے بڑے مثبت اثرات ظاہر ہورہے ہیں، اس لیے اگرچہ یہ کام بظاہر دشوار گزار معلوم ہوتا ہے لیکن اتنا مشکل بھی نہیں جتنا لوگوں نے سمجھ لیا ہے، وقت آگیا ہے کہ ہر مسلمان اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھے اور غور کرے کہ کیا اس نے اس فرض منصبی کو ادا کرنے کی ذرا بھی کوشش کی ہے؟ اور عزم کرے کہ وہ پوری توجہ کے ساتھ اس فراموش کردہ فریضہ کو انجام دے گا، جن کے لیے ہدایت مقدر ہوگی، ان کو ہدایت نصیب ہوگی۔

سچائی کیا ہے؟ (جاری)

بلال عبدالحی حسنی ندوی

مومن اور جھوٹ:

جب نبی اکرم ﷺ سے یہ پوچھا گیا کہ کیا مومن جھوٹا بھی ہوسکتا ہے؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: نہیں! مومن سب کچھ ہوسکتا ہے مگر جھوٹا نہیں ہوسکتا۔

آپ ﷺ نے یہ ایسی بات فرمائی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس بات کی کس قدر اہمیت ہے اور اس کا ایمان سے کس قدر تعلق ہے اور یہ چیز ایسی ہے جو اس وقت تقریباً معاشرہ میں ختم ہوتی چلی جارہی ہے، لوگ جھوٹ بولنا بہت معمولی سمجھتے ہیں اور اس کو بعض مرتبہ دین داری کے منافی نہیں سمجھتے، اب تو اچھے اچھے دین داروں کا حال بھی عجیب ہے۔

اللہ معاف کرے ایک صاحب مدرسہ کی رسید اور تعارف نامہ لے کر نکلے، تعارف نامہ میں چار سولڑکے لکھے ہوئے ہیں اور دس لاکھ خرچ دکھایا گیا ہے، مگر سچ یہ پتہ چلا کہ مدرسہ میں لڑکے صرف دوسو ہیں اور خرچ کل چھ لاکھ ہے، جس شخص نے یہ بات مجھے بتائی وہ بے چارہ تقریباً رونے لگا، وہ بندہ اسی مدرسہ کا چندہ کررہا تھا جس میں یہ سب فرضی لکھا ہوا تھا، کہنے لگا بڑے افسوس کی بات ہے کہ جو لوگ عالم نہیں ہیں، وہ لوگ رمضان کے مبارک مہینہ میں مسجدوں میں تلاوت کررہے ہیں، اللہ کے ذکر میں لگے ہوئے ہیں اور ہم لوگ جھوٹ بولتے پھر رہے ہیں۔ ہم نے کہا: تم نے اپنے مہتمم صاحب سے اس صریح جھوٹ کے متعلق کچھ کیوں نہیں کہا؟ تو اس نے جواب دیا کہ مہتمم صاحب ہی نے کہا ہے کہ دین کے مسئلہ میں جھوٹ بولنا جائز ہے۔ ہم نے کہا: لاحول ولاقوۃ الا باللہ، کیا اب دین اتنا سستا ہوگیا، اللہ کا دین تو بہت غیرت مند ہے، دین کے معاملہ میں جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے، مدرسہ کھولنے کی ضرورت ہی کیا تھی جب مدرسہ تمہارے بس میں نہیں ہے، ایسی صورت میں مدرسہ چھوڑ دینا چاہیے جس میں جھوٹ بولنا پڑے، مدرسہ کھولنا بالکل جائز نہیں اگر آدمی جھوٹ بول بول کر مدرسے چلائے۔

غرض کہ اس دور میں اس طرح کے تماشے ہورہے ہیں اور اس کو دین سمجھ لیا گیا ہے، حالانکہ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ مومن سب کچھ ہوسکتا ہے، وہ بزدل ہوسکتا ہے، بخیل ہوسکتا ہے، لیکن وہ جھوٹا نہیں ہوسکتا۔

دین اسلام جھوٹی بات کے متعلق بہت حساس ہے، اسی لیے زبان کی حفاظت اور اس کو قابو میں رکھنے کی ہمیشہ ہدایت کی گئی ہے، یہاں تک کہ مذاق میں بھی جھوٹ بولنا صحیح نہیں بتایا گیا ہے، ایک موقع پر آپ ﷺ نے دیکھا کہ ایک خاتون اپنے بچہ کو یہ کہہ کر بلارہی ہیں کہ آؤ بیٹا میں تم کو فلاں چیز دوں گی، تو آپ ﷺ نے اس سے کہا کہ کیا واقعی تم وہ چیز دوگی؟ اس عورت نے کہا: ہاں! اللہ کے رسول میں نے وہ چیز دینے کے لیے رکھی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر وہ چیز تم نہ دیتیں تو اللہ کے یہاں یہ بھی ایک جھوٹ لکھا جاتا۔

جھوٹ کو آدمی سمجھتا ہے کہ چھوٹی موٹی باتیں سب چل سکتی ہیں، حالانکہ اگر کوئی مذاق میں بھی جھوٹ بولتا ہے تو بولنا درست نہیں ہے، ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ اس میں تھوڑا سا اِمالہ ہو، یعنی مذاق میں کچھ باتیں ایسی کی جائیں جو وہ جھوٹ نہ ہوں، مگر ان کی سچائی سمجھنا مشکل ہو، جیسے ایک بوڑھیا آپ ﷺ کے پاس آئی، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ بوڑھیاں جنت میں نہیں جائیں گی۔ یہ سن کر وہ رونے لگی کہ ہم جنت میں نہیں جائیں گے تو ہمارا کیا ہوگا، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں! کوئی بوڑھا جنت میں نہیں جائے گا، بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ سب کو جوان کرکے جنت میں بھیجیں گے، اس لیے تم بھی بوڑھیا ہوکر جنت میں نہیں جاؤ گی، بلکہ جوان کردیا جائے گا۔

اس مثال سے سمجھا جاسکتا ہے کہ اس میں کچھ مذاق بھی ہوگیا اور بات بھی سچ رہی، آپ ﷺ سے اس طرح کا مذاق ثابت ہے جس میں جھوٹ کی آمیزش نہ ہو..... (باقی صفحہ/۱۵ پر)

نکاح کے فضائل، شرعی حیثیت اور چند احکام

مفتی راشد حسین ندوی

اسلام دین فطرت ہے، اس نے فطری تقاضوں کے دبانے کا کبھی مطالبہ نہیں کیا، البتہ فطرت پر چلنے کا صحیح راستہ بتایا، انسان کو کھانے پینے کی ضرورت ہے، اس کی ممانعت نہیں کی گئی، البتہ حلال وحرام کی تمیز سکھائی گئی، جس میں سراسر خود انسان کا فائدہ ہے، ٹھیک اسی طرح انسان فطری طور پر صنف مخالف کی طرف میلان رکھتا ہے اور اسے جنسی خواہش پیدا ہوتی ہے، اسلام نے اس فطری خواہش کو یکسر مٹانے اور ختم کرنے کا مطالبہ نہیں کیا، بلکہ اس پر روک لگائی، البتہ اس فطری خواہش کو پورا کرنے کے کچھ اصول بتائے جن پر عمل کرنا خود انسان کے لیے فائدہ مند ہے، یہ بھی بتایا گیا کہ صحیح اصولوں کے مطابق یہ خواہش پوری کی جائے اور اچھی نیت سے نکاح کیا جائے تو وہ عبادت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے اور اس میں ثواب ملتا ہے، اسی لیے نکاح کے فضائل بیان کیے گئے، اس کی ترغیب دی گئی اور بلا وجہ اس کو چھوڑ دینے والوں پر نکیر کی گئی، نکاح میں مشغولی کو انبیاء کرام علیہم السلام کی سنت اور نوافل میں مشغولی سے افضل قرار دیا گیا، اس سلسلہ کی چند آیات اور احادیث ذیل میں نقل کی جاتی ہیں:

بیوی سے محبت اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجاً لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ﴾ (الروم: ۲۱)

(اور یہ بھی اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لیے تم ہی میں سے جوڑے بنائے تاکہ تم اس سے سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان آپس میں محبت اور مہربانی رکھ دی، یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو غور وفکر کرتے ہیں)

نکاح کا حکم:

اور نکاح کا حکم دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنَى وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ذَلِكَ أَدْنَى أَلَّا تَعُولُوا﴾ (النساء: ۳)

(تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں ان میں سے دو اور تین اور چار تک سے نکاح کر سکتے ہو اور اگر تمہیں ڈر ہو کہ تم برابری نہ کر سکو گے تو ایک ہی پر یا (باندیوں پر اکتفا کرو) جو تمہاری ملکیت میں ہوں، اس میں لگتا ہے کہ تم ناانصافی سے بچ جاؤ گے)

اور احادیث میں نبی کریم ﷺ نے بھی مختلف موقعوں پر نکاح کی ترغیب دی اور اس کو انبیاء کرام کی سنت قرار دیا، چند احادیث ذیل میں ذکر کی جاتی ہیں:

(۱) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے تو آپ نے فرمایا: اے نوجوانو! تم میں سے جس کے پاس نکاح کرنے کا خرچ موجود ہو اسے چاہیے کہ شادی کر لے، اس لیے کہ اس سے بدنگاہی میں کمی ہوتی ہے اور شرم گاہ کی پاک دامنی پیدا ہو جاتی ہے اور جس کو شادی کی استطاعت نہ ہو وہ روزہ رکھے اس لیے کہ وہ اس کی شہوت کو کم کر دیتا ہے۔

(بخاری: ۵۰۶۵، مسلم: ۱۴۰۰)

(۲) حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: چار چیزیں انبیاء کرام کی سنتوں میں سے ہیں: حیاء، عطر لگانا، مسواک کرنا، نکاح کرنا۔

(ترمذی: ۱۰۸۰، مسند احمد: ۲۳۵۸۱)

(۳) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تین لوگوں کی مدد کو اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لازم کرلیا ہے: اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والا، وہ مکاتب غلام جو ادا کرنے کی نیت رکھتا ہو اور وہ نکاح کرنے والا جو پاک دامنی کے ارادہ سے نکاح کررہا ہو۔

(ترمذی:۶۵۵، نسائی:۳۲۱۸، ابن ماجہ:۲۵۱۸)

(۴) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ تین حضرات آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہرات کے گھر آئے، نبی کریم ﷺ کی عبادت کے بارے میں سوال کرنے کے لیے، جب ان کو بتایا گیا تو گویا انہوں نے اسے کم سمجھا تو انہوں نے کہا: آنحضرت ﷺ سے ہمارا کیا مقابلہ جب کہ آپ کے اگلے پچھلے سارے گناہ معاف کردیے گئے ہیں، تو ایک نے کہا: میں تو ہمیشہ رات بھر نماز پڑھوں گا، دوسرے نے کہا: میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا افطار کروں گا ہی نہیں اور تیسرے نے کہا: میں عورتوں سے الگ رہوں گا اور کبھی شادی نہیں کروں گا، تو نبی کریم ﷺ آئے اور فرمایا: تم ہی لوگوں نے ایسا ایسا کہا ہے؟ سنو! اللہ کی قسم! میں تم سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور تقویٰ کرنے والا ہوں، لیکن میں روزہ رکھتا ہوں افطار بھی کرتا ہوں، نماز پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے شادی کرتا ہوں، تو جو میرے طریقہ سے روگردانی کرے اس کا مجھ سے تعلق نہیں ہے۔ (بخاری:۵۰۶۳، مسلم:۱۴۰۱)

(۵) حضرت عبد اللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا: دنیا (جلد ختم ہونے والی) متاع ہے اور دنیا کی متاع (سامان) میں سب سے بہتر نیک بیوی ہے۔ (مسلم:۱۴۶۷)

(۶) حضرت انسؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں: نبی ﷺ نے فرمایا: جب بندہ شادی کرلیتا ہے تو وہ اپنے نصف دین کو مکمل کرلیتا ہے، تو باقی نصف کے بارے میں اسے اللہ سے ڈرنا چاہیے۔

(بیہقی، مشکوٰۃ:۲/۱۶۸)

نکاح کی شرعی حیثیت:

انسان کی حالت کے اعتبار سے نکاح کی شرعی حیثیت میں تبدیلی ہوجاتی ہے، چنانچہ انسان کی مختلف حالتوں کے اعتبار سے اس کی پانچ حیثیتیں بیان کی جاسکتی ہیں:

۱- جو شخص مہر اور بیوی کے نان نفقہ کی ادائیگی پر قادر ہو، ساتھ ہی اسے مکمل اطمینان ہو کہ وہ بیوی پر کسی طرح کا ظلم نہیں کرے گا اور شہوت اتنی بڑھی ہوئی ہو کہ نکاح کے بغیر زنا سے بچنا ممکن نہ ہو تو ایسے شخص پر نکاح کرنا فرض ہے، اس لیے کہ شریعت کا ایک اصول یہ ہے کہ جس چیز کو اختیار کیے بغیر حرام سے بچنا ممکن نہ ہو اس کو اختیار کرنا فرض ہوجاتا ہے۔ (شامی:۲/۲۸۲-۲۸۳)

۲- جو شخص نفقہ مہر وغیرہ کی ادائیگی پر قادر ہو اور اسے یہ اطمینان بھی ہو کہ وہ بیوی پر کسی طرح کا ظلم نہیں کرے گا اور اسے پہلے شخص کی طرح شادی نہ کرنے پر زنا میں پڑنے کا یقین تو نہ ہو لیکن یہ خطرہ اور اندیشہ ہو کہ اگر نکاح نہ کیا تو زنا بدنظری یا مشت زنی وغیرہ میں مبتلا ہوجائے گا تو اس پر نکاح واجب ہوجاتا ہے۔

(شامی:۲/۲۸۲)

۳- جو شخص نارمل حالت (حالت اعتدال) میں ہو یعنی نان نفقہ پر قدرت ہو، بیوی کے جملہ حقوق ادا کرسکتا ہو، اس پر ظلم کا خطرہ بھی نہ ہو، ساتھ ہی اسے اپنے اوپر قابو حاصل ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ نکاح نہ کرنے پر بھی وہ معصیت میں مبتلا نہیں ہوگا، تو ایسے شخص کے لیے نکاح کرنا سنت مؤکدہ ہے، اگر یہ شخص نکاح نہ کرے تو تارک سنت ہوگا اور گنہگاروں میں شمار کیا جائے گا۔ (شامی:۲/۲۸۲)

۴- اگر کسی شخص کو اندیشہ ہو کہ نکاح کرکے وہ نان نفقہ ادا نہیں کرسکے گا، یا حقوق زوجیت ادا نہیں کرسکے گا، یا اندیشہ ہے کہ کہیں بیوی پر ظلم نہ کر بیٹھے تو ایسے شخص کے لیے نکاح کرنا مکروہ تحریمی ہے۔

(البحر الرائق:۳/۱۴۰، شامی:۲/۲۸۲)

۵- اور اگر اس کو یقین ہو کہ بیوی کے مالی یا جنسی حقوق ادا

نہیں کرسکے گا تو اس کے لیے نکاح کرنا حرام ہے، اگر کرے گا تو حرام کا ارتکاب کرنے کا گناہ ہوگا۔ (شامی:۲/۲۸۲)

اگر کوئی ایسا شخص ہو جس کی حالتوں میں ٹکراؤ ہو جائے یعنی ایک طرف اس کی شہوت اس طرح بڑھی ہوئی ہے کہ اس کو زنا کا اندیشہ یا یقین ہے، دوسری طرف یہ بھی ہے کہ اسے بیوی کے اوپر ظلم وتعدی کا اندیشہ یا یقین ہے تو ایسی صورت میں اس پر نکاح فرض یا واجب نہیں رہے گا، بلکہ نکاح کرنا مکروہ ہوگا، اپنی شہوت روزہ رکھ کر کم کرے، ہاں اگر بیوی پر ظلم کا اندیشہ نہیں ہے، لیکن مہر اور نان نفقہ میں کمزوری ہے تو وہ نکاح کرلے اور نان نفقہ کی ادائیگی کے لیے قرض لے لے، حدیث شریف میں اوپر ذکر ہوا کہ انشاء اللہ اس کی مدد اللہ تعالیٰ کرے گا۔ (شامی:۲/۲۸۲)

جس کے پاس نکاح کے اسباب نہ ہوں وہ کیا کرے؟

اگر کسی شخص کو نکاح کا تقاضا ہو لیکن نہ تو اسے نکاح کے اسباب حاصل ہوں، نہ ہی قرض وغیرہ کے ذریعہ ان اسباب کو حاصل کرسکتا ہو تو اوپر حدیث میں دی گئی ہدایت کے مطابق اسے چاہیے کہ مسلسل روزے رکھے، اس سے انشاء اللہ نفسانی تقاضے میں کمی واقع ہو جائے گی، بعد میں اللہ اسباب مہیا کردے تو شادی کرلے۔

پہلے شادی کرے یا حج؟

اگر کسی کے اوپر حج کے مصارف ہونے کی وجہ سے حج واجب ہو جائے اور اسے نکاح کی بھی حاجت ہو تو اگر نکاح نہ کرنے سے گناہ میں مبتلا ہونے کا یقین ہو تو نکاح کرے گا اور اگر ایسی کیفیت نہ ہو تو اگر حج کا زمانہ بالکل قریب ہو تو حج کرے اور اگر حج کے سفر میں ابھی دیر ہو تو وہ حج سے پہلے نکاح کرسکتا ہے۔ (شامی:۲/۱۵۶)

بقیہ: سچائی کیا ہے؟

.....مذکورہ حدیث میں آپ ﷺ کی بات بالکل صحیح تھی کہ بوڑھے جنت میں نہیں جائیں گے، بلکہ اللہ تعالیٰ انہیں جوان کرکے جنت میں داخل کریں گے، تو اس طرح کی اگر کوئی شخص مذاق میں بات کرے تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں، لیکن اگر کوئی شخص مذاق میں سراسر جھوٹ بول رہا ہے تو اس کی اجازت نہیں، اس لیے کہ ایک ایمان والا کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا، وہ جو کہتا ہے سچ کہتا ہے۔

عام بول چال میں سچائی کا لحاظ:

حضرت عبداللہ بن عامرؓ سے روایت ہے ایک دن مجھ کو میری والدہ نے بلایا اس وقت حضور ﷺ میرے گھر میں تشریف فرما تھے، والدہ نے فرمایا: آؤ میں تمہیں دوں، تو حضور ﷺ نے میری والدہ سے فرمایا: تم نے کیا دینے کے لیے بلایا تھا؟ والدہ نے فرمایا: میں نے ایک کھجور دینے کے لیے بلایا تھا، حضور ﷺ نے فرمایا: اگر بلا کر کچھ نہ دیتیں تو یہ جھوٹ میں شمار ہوتا۔ (ابوداؤد:۴۹۹۱)

عام طور سے گھروں میں ایسا ہوتا ہے کہ مائیں اپنے بچوں سے کہتی ہیں کہ بیٹا آؤ ہم تمہیں ٹافی دیں گے، جب کہ ہاتھ میں ٹافی نہیں ہوتی، یا کہیں گی کہ بیٹا آؤ ہم تمہیں مٹھائی دیں گے، جب کہ مٹھائی کچھ بھی نہیں ہوتی، بلکہ مائیں صرف پھسلانے اور بلانے کے لیے جھوٹ بولتی ہیں، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یہ بھی ایک جھوٹ ہے اور اس کی بھی بالکل اجازت نہیں ہے۔

یعنی اگر کوئی اس طرح محض بہلانے پھسلانے کے لیے بھی کرے گا تو وہ جھوٹ لکھا جائے گا۔

عام طور پر بہت سے لوگوں میں بھی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ محض تفریح کے لیے لوگوں کے درمیان کچھ بھی جھوٹ بول دیتے ہیں، مثلاً: کسی نے بول دیا کہ فلاں جگہ پیسے بٹ رہے ہیں، فلاں جگہ فلاں چیز تقسیم ہو رہی ہے، جب کہ ایسا کچھ نہیں ہوتا ہے۔

اس حدیث سے یہ پتہ چلا کہ ایسی تفریح کی شرعاً بالکل اجازت نہیں جس میں سراسر جھوٹ بولا جائے۔ مذاق میں بھی صریح جھوٹ کی اجازت نہیں، اس لیے کہ جھوٹ بہر حال جھوٹ ہے اور ایمان والا کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔

ملت ابراہیمی یعنی دین محمدی صلی اللہ علیہ وسلم

عبدالسبحان ناخداندوی

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

﴿وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَى تَهْتَدُوا قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾ (البقرۃ: ۱۳۵)

(وہ کہتے ہیں کہ یہودی یا نصرانی ہو جاؤ راہ پر آجاؤ گے، آپ فرمادیجیے بلکہ ہم تو یکسور ہنے والے ابراہیم کی ملت پر رہیں گے اور وہ تو شرک کرنے والوں میں نہ تھے۔)

جو قومیں اپنی منزل کھوٹی کر چکی ہوتی ہیں، ان کی فطرت میں ایک خاص قسم کی ضد پیدا ہوتی ہے، ان میں ایسی عالی حوصلگی نہیں ہوتی کہ اپنی کمیوں کو درست کریں، الٹے جب صحیح بات ان تک پہنچتی ہے تو وہ ضد میں آکر اپنی غلط کاریوں پر اور جم جاتے ہیں، جاہلی نخوت اس طرح ابھر آتی ہے کہ حق کو جان کر انجان بننا ان کو اچھا لگتا ہے، یہود ونصاری ایک طویل مدت تک دینی ٹھیکیدار بنے ہوئے تھے، جب حقیقۃً دین حق اپنی تابانی کے ساتھ نمودار ہوا تو ان سے برداشت نہ ہوسکا اور یہ جاننے کے باوجود کہ ان کا دین اب تحریفات کا شکار ہوکر اپنی شکل وصورت کھو چکا ہے، وہ یہودیت ونصرانیت کی دعوت دینے لگے، یہی معاملہ مشرکین مکہ کا ہوا، ان کی جاہلی نخوت کو یہ گوارا نہ ہوسکا کہ کوئی ان کے دین کو غلط ٹھہرائے، خود اہل کتاب میں بھی اختلاف اس وقت عروج پر نظر آتا جب واضح حق ان تک پہنچ جاتا:

﴿وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِن بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ﴾ (اہل کتاب کا اختلاف اسی وقت ابھر کر سامنے آتا جب ان کے پاس واضح احکامات آتے)

یہ تو ان کی آپسی لڑائیاں تھیں جو ہر نبی کی بعثت کے وقت ابھر کر سامنے آئیں، یہاں معاملہ نبی آخر الزماں کا تھا، جن کے ذریعہ سارے دین منسوخ ہوگئے اور ایک صحیح دین پوری آب وتاب کے ساتھ نمودار ہوا، بس اہل کتاب کے آگ لگ گئی، انہوں نے محض ضد میں یہ کہنا شروع کیا کہ اصل ہدایت تو ہمارے پاس ہے، یہودی بن جاؤ ہدایت پاجاؤ گے، نصاریٰ تو ہر دور میں یہود کے مقلد محض رہے ہیں، انہوں نے بھی یہی راگ بلند کیا کہ اگر ہدایت کہیں ہے تو نصرانیت میں ہے، جو نشان منزل گم کردیتے ہیں ان کو صحیح نشان بتایا جائے تو یہی ضد پیدا ہوتی ہے کہ ہمیں بتانے والا کون آگیا! بعینہٖ یہی معاملہ یہود کے ساتھ ہوا، ان کی نخوت کو یہ گوارا نہ ہوا کہ ہدایت کا علم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں آئے، رؤساء یہود شب وروز یہ کہنے لگے کہ یہودی بن جاؤ ہدایت یافتہ ہوجاؤ گے، حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کبھی بھولے بھٹکے بھی ان کو دعوت کا خیال تک نہ آتا، یہ محض ضد تھی، ورنہ وہ خوب جانتے تھے کہ معاملہ ان کے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔

یہ آیت رؤساء یہود سے متعلق نازل ہوئی، جن میں کعب بن الاشرف، مالک بن الصیف، وہب بن یہود اور ابی یاسر بن انطب وغیرہ شامل ہیں، اللہ کے سچے پیغام کو ان لوگوں نے مذہبی لڑائی بنادیا، شب وروز یہود کی ایک ہی رٹ تھی کہ توریت سب سے افضل کتاب ہے اور حضرت موسیٰ سب سے افضل نبی ہیں، ان کی دیکھا دیکھی عیسائیوں نے بھی اپنے مذہب دینی کے بارے میں یہی باتیں کہیں، یہ ایک صاف سچی دعوت کو غلط مذہبی رنگ دینے کی نادانستہ کوشش تھی، اللہ کی طرف سے بات صاف کردی گئی کہ لغویات میں اپنے آپ کو تباہ کرنے کے بجائے ملت ابراہیمی کا دامن تھام لو جس کے سب سے بڑے اور دائمی علم بردار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں..... (باقی صفحہ/۱۸ پر)

طاقت کا نشہ

محمد ارمغان بدایونی ندوی

نشہ آور اشیاء ہر سماج میں ناپسندیدہ ہیں، نشہ کا انجام نہایت مہیب ہے اور نشہ کا چسکا انتہائی مضر!

اشیائے خوردنی کا نشہ ہڈیاں گلاتا ہے، مہلک بیماریاں بناتا ہے، دماغ کو مفلوج کرتا ہے، معدہ کو تباہ کرتا ہے، اعصاب کو متاثر کرتا ہے، جسم میں زہریلے مادے پھیلاتا ہے اور بالآخر گھر بار تباہ کردیتا ہے۔ نشہ زندگی کی ضد ہے، زندگی پرواز چاہتی ہے اور نشہ تنزلی، زندگی ہمسایے چاہتی ہے اور نشہ بے گانے، زندگی آبادی چاہتی ہے اور نشہ بربادی، زندگی عزت چاہتی ہے اور نشہ بے عزتی، زندگی اعلیٰ معیار چاہتی ہے اور نشہ ادنیٰ معیار، زندگی بلند عزائم چاہتی ہے اور نشہ فقط ایک کش!

دنیا میں نشہ کی مختلف اقسام اور متعدد شکلیں ہیں، جن میں نشہ کی ایک قسم ''طاقت کا نشہ'' بھی ہے، طاقت کا نشہ دنیا کے سبھی نشوں سے زیادہ خطرناک، مہلک اور تباہ کن ہے، اس کا فلسفہ سب سے الگ اور مضرات نہایت سنگین اور بہت ہی گہرے ہیں۔

طاقت فی نفسہٖ شئ محمود ہے، تاہم نشہ ہر اس چیز کا حرام ہے جو انسان کے اندر سے انسانیت کا عنصر ہی چھین لے، طاقت کا وجود ظلم مٹاتا ہے مگر طاقت کا نشہ ظلم کو فروغ دیتا ہے، طاقت کا وجود بدعنوانی ختم کرتا ہے مگر طاقت کا نشہ بدعنوانی کو بڑھاوا دیتا ہے، طاقت کا وجود امن کا نفاذ کرتا ہے مگر طاقت کا نشہ بدامنی پھیلاتا ہے، طاقت کا وجود تحفظات فراہم کرتا ہے مگر طاقت کا نشہ تحفظات ختم کرتا ہے، طاقت کا وجود ترقی کے آنے بانے بنتا ہے مگر طاقت کا نشہ ترقی کے سانچے ہی توڑ پھوڑ دیتا ہے، طاقت کا وجود ماہرین فن کی دریافت کرتا ہے مگر طاقت کا نشہ چوروڈاکو پیدا کرتا ہے، طاقت کا وجود ملکوں کو مضبوط کرتا ہے مگر طاقت کا نشہ ملکوں کی بنیادیں ہلا دیتا ہے، طاقت کا وجود بھید بھاؤ کی سڑاہن کو صاف کرتا ہے مگر طاقت کا نشہ بھید بھاؤ کے جراثیم کو پروان چڑھاتا ہے، طاقت کا وجود انسانوں کو حقوق دلاتا ہے مگر طاقت کا نشہ انسانوں کے حقوق چھین لیتا ہے۔

طاقت کا نشہ ایک لاعلاج بیماری ہے، جس میں افکار واقدار اور معیار بدل جاتے ہیں، ذہن کی سوچ اور سوچنے کا ڈھنگ تبدیل ہوجاتا ہے، بصارت پر دبیز پردے حائل اور بصیرت سے محرومی ہوجاتی ہے، انسانی ضمیر مردہ اور حس لطافت بے جان ہوجاتی ہے۔

طاقت کا نشہ جب سر چڑھ کر بولتا ہے تو ظلم کو انصاف، ستم کو کرم، گالی کو مرہم اور مفلسی کو امیری سمجھا جاتا ہے، پھر نوجوانوں کا مستقبل سیاہ ہوتا ہے، ان کی زندگی کا استحصال اور ان کی طاقت کا ناجائز استعمال کیا جاتا ہے۔ بلاشبہ طاقت کا نشہ ملکوں کو تباہ کردیتا ہے، نسلوں کو برباد کردیتا ہے، تہذیبوں کو مسخ اور حریت رائے کا حق سلب کرلیتا ہے۔

طاقت کا نشہ حسن وقبح کا فرق ختم کردیتا ہے، اچھے بھلے کی تمیز مٹا دیتا ہے، اسی لیے وہ نااہلوں کو خوب نوازتا ہے، ان کی جرأتیں بڑھاتا ہے، انہیں معصومیت کے تمغے دیتا ہے، اعلیٰ مناصب پر بٹھاتا ہے، جن کے ذریعہ اپنے ناپاک منصوبے کامیاب بناتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ نشہ فرعونی سامراج کو فروغ دیتا ہے، بدعنوانی کو ہوا دیتا ہے، معیشت کو ابتر کرتا ہے اور قوموں کو تاراج کردیتا ہے۔

طاقت کا نشہ بہت گہرا ہے اور اس کی پالیسی بھی حد درجہ زہر آگیں، جب سرعام اس نشہ کا طوطی بولتا ہے تو زندگی کا ہر شعبہ اس کے قدموں میں ڈھیر ہوجاتا ہے، ذرائع ابلاغ اس کا مطیع، محکمہ امن اس کا ناز بردار، محکمہ تفتیش اس کے اشارۂ ابرو کا پابند، محکمہ انتخابات اس کے

کنایوں کا رازداں اور محکمہ انصاف اس کا رہین منت ہوجاتا ہے۔

طاقت کا نشہ سماج کے ہر طبقہ پر اثر انداز ہوتا ہے، جس کے اثرات لوگوں کے کردار و گفتار میں جھلکتے ہیں، معلمین کا طریق تفہیم جدا ہوجاتا ہے، اہل سیاست کا لب ولہجہ کرختگی اختیار کرلیتا ہے، تحریکوں کا ایجنڈا بدل جاتا ہے اور اس نشہ سے متاثر عام آدمی کا طرز سخن بھی زہر آلود ہوجاتا ہے۔

طاقت کا نشہ ایک غیر محدود سماجی وبا ہے، اگر اہل دانش وبینش اس کا شکار ہوجائیں تو یہ تاریخ میں تحریف، نصاب تعلیم میں زہر افشانی اور دفاتر میں رشوت ستانی کو روا کردیتا ہے۔ اور اگر ارباب حل وعقد اس کے عادی ہوجائیں تو یہ مظلوموں پر ظلم، معصوموں پر بربریت، نہتوں پر ڈاکہ، شریفوں سے چھیڑ چھاڑ، صنف نازک کی بے عزتی اور جویان حق کو قتل کی راہ دکھاتا ہے۔

طاقت کا نشہ متعدی اور اس کا نتیجہ تخریب کاری ہے، یہ نشہ اخلاق کا دیوالیہ کردیتا ہے، قوموں کی تقدیر میں خط غلامی کھینچ دیتا ہے، ملکوں کی قسمت میں معاشی بحران چسپاں کردیتا ہے، انسانی سماج میں نفرت کی خندقیں کھود دیتا ہے اور پسماندہ طبقات کی زندگی سے روشن مستقبل کی اصطلاح غائب کردیتا ہے۔

طاقت کا نشہ جذبہ تعمیر کے منافی ہے، جذبہ تعمیر صالح افراد چاہتا ہے اور طاقت کا نشہ فاسد افراد، جذبہ تعمیر عروج چاہتا ہے اور طاقت کا نشہ زوال، جذبہ تعمیر امن چاہتا ہے اور طاقت کا نشہ خوف وہراس، جذبہ تعمیر تعلیم یافتہ سماج چاہتا ہے اور طاقت کا نشہ جہالت!

بقیہ: ملت ابراھیمی .....

.....اسی ملت ابراہیمی پر بنی اسماعیل و بنی اسرائیل سب کا اتفاق تھا، موسیٰ اپنے دور میں اسی پر قائم تھے، عیسیٰ مسیح کا بھی یہی دین تھا، محمد ﷺ کوئی نئی بات نہیں پیش کررہے ہیں، تمہاری کھوئی ہوئی حقیقت تمہیں یاد دلانے کے لیے مبعوث ہوئے ہیں، اسے اگر تم مذہبی رنگ دے کر جھگڑنے کی کوشش کروگے تو یہ اس کی دلیل ہوگی کہ تم ملت ابراہیمی کو پسند کرنے والے نہیں بلکہ اپنی نفسانیت کے گرفتار ہو، یہ بات بھی غور کرنے کے قابل ہے کہ یہاں آپ ﷺ کے نام پر ان کو بلایا نہیں گیا بلکہ "ملة ابراهيم" کے حوالہ سے دعوت دی گئی، یہ دعوت کا حکیمانہ انداز ہے بات کو اس سلیقہ سے کہا جائے کہ مخاطب بھلے مخالف ہو وہ بھی کچھ سوچنے پر مجبور ہوجائے، ظاہر بات ہے کہ یہاں ملت ابراہیم سے مراد دین محمد ﷺ کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے، آپ ﷺ ملت ابراہیم کو صحیح طور پر قائم کرنے اور اسے عالمگیر پیمانے پر دنیا کے ہر خطے میں پہنچانے کے لیے مبعوث ہوئے تھے، پھر چونکہ آپ ﷺ آخری دائمی رسول ہیں، اس لیے آپ کے حوالہ سے اس دین کی پہچان ہوئی اور آپ کی سیرت وکردار کو حرف آخر قرار دیا گیا کہ اب اس کے بغیر کوئی محبت خداوندی کے حصول تک پہنچ ہی نہیں سکتا، ورنہ غور کیا جائے تو ملت ابراہیم اور سنت نبوی ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں، اسی لیے جابجا آپ ﷺ نے حضرت ابراہیم اور اپنی ذات مبارک کو ایک دوسرے سے نہایت مشابہ قرار دیا ہے۔

حضرت ابراہیم کی شریعت کو "حنیفیت" کہتے ہیں، حضرت ابراہیم کی شریعت کی سچی پیروی کرنے والے کو "حنیف" کہتے ہیں، "حَنَفٌ" مائل ہونے کو کہتے ہیں، جو شخص تمام غلط ادیان کو چھوڑ کر صحیح دین کو پوری یکسوئی سے اپنالیتا ہے وہ حنیف ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک امتیازی صفت حنیف ہے، وہ سب سے کٹ کٹا کر محض ایک اللہ کے ہوگئے تھے، اس لیے آپ کی شریعت ہی کو "ملت حنیفیہ" کہا گیا، یہاں اس کا حکم ہے کہ موجودہ یہودیت نصرانیت اور عربوں کا دین جو سراپا شرک بن چکا تھا، سب اپنی حقیقت کھو چکے، اب کیوں نہ اپنی ضد چھوڑ کر ابراہیم کی شریعت کی پیروی کی جائے، اسی نقطہ پر سب کا اتفاق ہوسکتا ہے اور قرآن عظیم نے وہی دینی نقطہ اتفاق "ملت ابراہیم" کے نام پر پیش کیا۔

انسانیت کے بدلتے پیمانے

محمد نفیس خاں ندوی

آج کی دنیا میں جنگوں کے اصول بدل چکے ہیں، جنگوں کے طریقۂ کار اور ان کے مقاصد میں بھی نمایاں تبدیلی واقع ہو چکی ہے، پہلے جنگیں بہادری کی بنیادوں اور مضبوط جنگی حکمت عملی کے ذریعہ جیتی جاتی تھیں، ان جنگوں میں براہ راست وہی متاثر ہوتے تھے جو میدان جنگ میں ہوتے تھے، بے گناہ عورتیں، معصوم بچے اور مجبور ولاچار افراد بڑی حد تک محفوظ ہوتے تھے، لیکن آج کی جنگوں میں بے گناہ اور معصوم افراد کی زندگیاں سب سے زیادہ نشانہ بنتی ہیں، خاص کر جنگ بندی کے بعد پھیلنے والے مختلف خطرناک امراض کا، خواہ ان کا ان جنگوں سے دور کا بھی تعلق نہ ہو، اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے گزشتہ دور کی جنگوں کے مقابل آج کی جنگوں میں جس تسلسل سے انسانی قتل وغارت گری ہوتی ہے، اس سے پہلے اس کا تصور بھی نہ تھا۔

جنگی پیمانوں کے ساتھ اب مذہبی پیمانے بھی بدل چکے ہیں، مذہب کے نام پر مخصوص طبقہ کو نشانہ بنایا جاتا ہے، علامتوں کے ذریعہ نشاندہی کی جاتی ہے، پھر مختلف میدانوں میں ٹارگیٹ کیا جاتا ہے، سیاسی ومعاشی سطح پر کمزور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، ان کے مذہبی مقامات کو مسمار کرنے کی سازش رچی جاتی ہے، اور جب اس سے بھی جب سکون نہیں ملتا تو کوئی جنونی بھیڑ آگے بڑھتی ہے اور کسی راہ چلتے انسان پر ٹوٹ پڑتی ہے اور اس کے خون سے اپنی مذہبی پیاس بجھا کر مطمئن ہو جاتی ہے کہ اس نے اپنے مذہب کی بڑی خدمت انجام دے دی جبکہ وہ دور بھی تھا جب قوموں اور ملکوں کو فتح کرنے والی مسلم قوم سب سے پہلے محکوموں کے مذہبی مقامات کو تحفظ فراہم کرتی تھی، ان کے وظیفے مقرر کرتی تھی اور خوف ودہشت کے بجائے اپنے اعلیٰ اخلاق اور اپنی انصاف پسندی سے اپنے مذہب کی اشاعت کرتی تھی۔

ایک طرف یہ دعوی کیا جاتا ہے کہ آج کا دور امن وسلامتی کا دور ہے لیکن شاید سب سے زیادہ انسان آج کے دور میں ہی غیر محفوظ ہے، صبح کو انسان گھر سے نکلے تو اس کی کوئی گارنٹی نہیں کہ وہ شام کو صحیح سلامت گھر لوٹے گا، نہ تفریح گاہیں محفوظ ہیں اور نہ گذرگاہیں مامون ہیں، بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان ایک خوف کے عالم میں جی رہا ہے، ایک ایسی زندگی جس میں زندگی کی کوئی چمک نہیں۔

اس دور کا انسان ایک عجیب دور سے گذر رہا ہے، سائنسی ترقیات نے انسانی زندگی کو جس قدر پرتعیش اور آرام دہ بنا دیا ہے کہ گذشتہ دور کا انسان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، مالی آسودگی کے لیے اس نے زمین کے خزانے تلاش کر ڈالے، اور جس قدر سرمایہ اور وسائل پر قدرت حاصل کر لی ہے اس کا کبھی گمان بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، لیکن پھر بھی آج کا انسان اس قدر بھوکا ہے کہ تاریخ میں اتنا بھوکا کبھی نہ تھا۔

گذشتہ ادوار میں بادشاہوں کے محلات جتنے بھی شاندار رہے ہوں گے نہ وہ خود کو موسم کی شدت سے بچا سکتے تھے اور نہ دوران سفر گھوڑے، اونٹ اور ہاتھی کے ہچکولوں سے خود کو محفوظ رکھ سکتے تھے، اپنے فوجیوں یا ماتحتوں سے پیغام رسانی میں انھیں ہفتہ دس دن اور بسا اوقات سال بھی لگ جاتے تھے، لیکن آج کے انسان کا حال یہ ہے کہ جس جگہ آسمان سے برف باری ہو رہی ہوتی ہے وہاں وہ گرم کمرے میں بیٹھا ہوا آئس کریم سے لطف اندوز ہو رہا ہوتا ہے، گداز صوفوں پر پیر پھیلائے، خواب خرگوش کے مزے لوٹتے ہوئے وہ چند گھنٹوں میں سیکڑوں میل کا سفر طے کر لیتا ہے، وہ ہزاروں میل دور سے اپنے اہل خانہ اور اہل تعلق کی باتیں بھی سن سکتا ہے اور انھیں دیکھ بھی سکتا ہے، لیکن

مجموعی حیثیت سے آج کا انسان جس قدر بے چین، بے کل اور پریشان ہے اتنا ماضی میں کبھی نہ تھا، اس کا اندازا اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آج سیکورٹی فراہم کرنے والی خفیہ ایجنسیاں اس قدر حساس اور فعال ہیں کہ سیکڑوں میل دور سے انسان کی حرکات وسکنات نوٹ کر لیتی ہیں، لیکن پھر بھی امریکہ جیسے ملک میں ایسے شہر بھی ہیں جہاں پولس اور دوسرے سیکورٹی ادارے اپنے شہریوں کو انتباہ کرتے ہیں کہ رات کو فلاں وقت کے بعد وہ ان کی حفاظت کرنے سے قاصر ہیں، جبکہ ماضی میں ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جب ایک دوشیزہ زیورات سے لدی اپنے جان ومال اور اپنی عزت وآبر کی حفاظت کے ساتھ صحرا عبور کر لیتی تھی، اور اسے سوائے خدا کے کسی کا خوف نہیں رہتا تھا۔

آج کے انسان اور ماضی کے انسان میں خاصا فرق موجود ہے، آج کا انسان صرف آج کا ہو کر رہ گیا ہے، یا یوں کہیے کہ آج کی مادی ترقیات کی چمک کے سامنے اس کے دل کی نگاہیں بے نور ہو گئی ہیں، وہ اشیاء کا ظاہر تو دیکھ سکتا ہے لیکن ان اشیاء کی حقیقت کا شعور حاصل کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو گیا ہے، وہ کھلی آنکھوں سے دنیا کی رعنائیاں دیکھ سکتا ہے لیکن دنیا کے انجام سے غافل ہو چکا ہے، پیٹ کی آگ بجھاتے بجھاتے وہ جہنم کی آگ بھول چکا ہے، دنیا کی لذتوں میں اس قدر کھو چکا ہے کہ خالق کائنات کو فراموش کر بیٹھا ہے اور سرمایہ پرستی میں غرق ہو گیا ہے، بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ آج کی برائیاں گذشتہ دنوں کے مقابلہ کہیں زیادہ سنگین اور عام ہو چکی ہیں، حالانکہ وسائل کی فراوانی، رزق کی بہتات اور صنعتی انقلاب سے انسان کو بکثرت سہولتیں مہیاں ہیں جن کے نتیجہ میں برائیوں کا گراف کم ہونا چاہیے تھا، لیکن ان ترقیات کے نتیجہ میں برائیوں میں اور اضافہ ہوتا چلا گیا، بلکہ ان برائیوں نے سماج میں عزت وشرافت کی پہچان حاصل کر لی، جن برائیوں سے لوگ پہلے گھن کرتے تھے اب وہ ترقی پسندی کی علامت سمجھی جانے لگی ہیں، اور ان برائیوں کی شناعت کے پیمانے بھی متعین کیے جا رہے ہیں، اگر کوئی معمولی طبقہ کا انسان ایک برائی کرتا ہے تو اس کی سنگینی زیادہ محسوس کی جاتی ہے، لیکن اگر وہی برائی کوئی صاحب حیثیت کرے تو اس کی ہنر مندی وفنکاری سے تعبیر کیا جاتا ہے، بقول شاعر

جن کے گھر میں امیری کا شجر لگتا ہے
ان کا ہر عیب زمانے کو ہنر لگتا ہے

قصہ مختصر، بے تحاشا مادی وسائل، انتہائی پر تعیش زندگی، اور اعلی ترین جنگی وسائل کی فراوانی' انسان کو چین وسکون فراہم کرنے سے قاصر ہیں، بلکہ سکون کی تلاش میں وہ نشہ میں دھت رہتا ہے اور مدہوشی کے مختلف طریقے اختیار کرتا ہے تا کہ دنیا کے حقائق سے زیادہ سے زیادہ دور رہا جائے، لیکن یہ صورتحال مسائل کو حل کرنے کے لیے ناکافی ہیں، یہ وہ طریقہ علاج ہے جس سے شفا ممکن نہیں، علاج کا یہ طریقہ مرض کو اور سنگین کرتا جائے گا، نئے نئے تجربات اور نئی نئی تحقیقات کے ذریعہ سکون قلب کی تلاش محض ضیاع وقت ہے۔

تاریخی شہادتیں موجود ہیں کہ حقیق راحت اور قلبی سکون کی تلاش میں انسان نے ہمیشہ فطرت سے بغاوت کی ہے، اس نے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائی ہیں، ہر ہر آستانہ پر ماتھا ٹیکہ اور ہر ہر در پر اپنا سر پھوڑا ہے، وہ کبھی پہاڑ کی بلندیوں پر چڑھ گیا، کبھی سمندر کی تہوں میں اتر گیا اور کبھی بھٹکتے بھٹکتے جنگلوں میں جا بسا لیکن اس کی مراد وہاں بھی پوری نہ ہوئی اور وہ سکون قلب کے لیے تڑپتا رہا۔ اس ترقی یافتہ دنیا نے بھی مختلف ازم اختیار کیے ہیں، مختلف وسائل میں سکون کی تلاش کی ہے، مختلف تحریکوں اور جماعتوں سے اس نے قلبی وذہنی راحت حاصل کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ہر در سے اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا، بلکہ ہر کوشش کے بعد اس کے اضطراب وبے چینی میں اضافہ ہی ہوا ہے۔

سارے تجربوں اور سارے نسخوں کے بعد اس کے سامنے صرف ایک ہی نسخہ ہے جسے جب بھی اختیار کیا گیا' دنیا جنت نشاں بن گئی، انسانیت آج بھی اسی در کی محتاج ہے، حقیقی سکون اسی در سے نصیب ہوگا، جس کا طریقہ قرآن نے اپنے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے: اُدْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّة (اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ) حقیقی سکون کا یہی وہ پیمانہ ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں!

اصلاحی خطبات

اسلام کے تطبیقی پہلو پر توجہ کی ضرورت

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی

''آج ہماری توجہ سیاست کی طرف ہے، معیشت کی طرف بھی ہے، معاشرت کی طرف بھی ہے، لیکن فرد کی تعمیر کے لیے اور فرد کی اصلاح کے لیے ادارے نایاب ہیں، الا ماشاء اللہ! اس وجہ سے آج ہماری تحریکیں کامیاب نہیں ہورہی ہیں، کسی نہ کسی مرحلہ پر جا کر ناکام ہوجاتی ہیں، یہ ناکامی بعض اوقات اس لیے ہوتی ہے کہ خود ہمارے آپس میں پھوٹ پڑ جاتی ہے اور لڑائی جھگڑا شروع ہوجاتا ہے۔

ہماری ناکامی کا دوسرا سبب میری نظر میں یہ ہے کہ اسلام کے تطبیقی پہلو پر ہمارا کام یا تو مفقود ہے، یا کم از کم ناکافی ہے، اس سے میری مراد یہ ہے کہ ایک طرف تو ہم نے اجتماعیت پر اتنا زور دیا کہ عملاً اسی کو اسلام کا کل قرار دے دیا اور دوسری طرف اس پہلو پر کما حقہ غور نہیں کیا اور نہ اس کے لیے کوئی منضبط لائحہ عمل تیار کیا اور اگر کوئی لائحہ عمل تیار کیا تو وہ ناکافی تھا، میں یہ نہیں کہتا کہ خدانہ کرے اسلام اس دور میں قابل عمل نہیں ہے، اسلام کی تعلیمات کسی بشری ذہن کی پیداوار نہیں، یہ اس مالک الملک والملکوت کے احکام ہیں جس کے علم وقدرت سے زمان ومکان کا کوئی حصہ خارج نہیں، لہٰذا جو شخص اسلام کو اس دور میں ناقابل عمل قرار دے، وہ دائرۂ اسلام میں نہیں رہ سکتا، لیکن ظاہر ہے کہ اسلام کو اس دور میں برپا اور نافذ کرنے کے لیے کوئی طریق کار اختیار کرنا ہوگا، اس طریق کار کے بارے میں سنجیدہ تحقیق اور حقیقت پسندانہ غور وفکر اور تحقیق کی کمی ہے۔ ہم اسلام کے لیے کام کررہے ہیں، اس کے لیے جدوجہد کررہے ہیں اور اس کے عملی نفاذ کے لیے تحریک چلا رہے ہیں، لیکن تحریک چلانے سے پہلے اور تحریک کے دوران سب کے ذہنوں میں یہ بات ہو کہ اسلام کے نفاذ کے معنی یہ ہیں کہ قرآن وسنت کو نافذ کردیں گے، مگر یہ بات یاد رکھئے کہ جب اسلامی احکام کو موجودہ زندگی پر نافذ کیا جائے گا تو یقیناً اس کا کوئی طریق کار متعین کرنا ہوگا، دیکھنا یہ ہوگا کہ وہ تطبیق کا طریقہ کیا ہوگا؟ اور آج ہم اسلام کے ان ابدی اور سرمدی اصولوں کو کس طرح نافذ کریں گے؟ اس کے بارے میں ہم ابھی تک ایسا سوچا سمجھا لائحہ عمل تیار نہیں کرسکے جس کے بارے میں ہم یہ کہہ سکیں کہ یہ پختہ طریق کار ہے، اس کے لیے کوششیں بلاشبہ پورے عالم اسلام میں اور خود ہمارے ملک میں ہورہی ہیں، لیکن کسی کوشش کو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ حتمی اور آخری ہے۔

موجودہ دور میں اسلام کی تطبیق کے طریقے سوچنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اسلام پر عمل جراحی شروع کردیا جائے اور اس میں کتر وبیونت کرکے اسے مغربی تصورات کے سانچے میں ڈھال دیا جائے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اسلام کے تمام اصول اور احکام اپنی جگہ باقی رہیں، ان کے اندر کوئی تبدیلی نہ ہو، لیکن یہ بات طے کی جائے کہ جب ان اصولوں کو اس دور میں برپا کیا جائے گا تو اس صورت میں اس کا عملی طریقہ کار کیا ہوگا؟''

R.N.I. No.
UPURD/2009/28748

Monthly
Payam-e-Arafat
Raebareli

Volume: 14 ✦ June 2022 ✦ Issue: 06

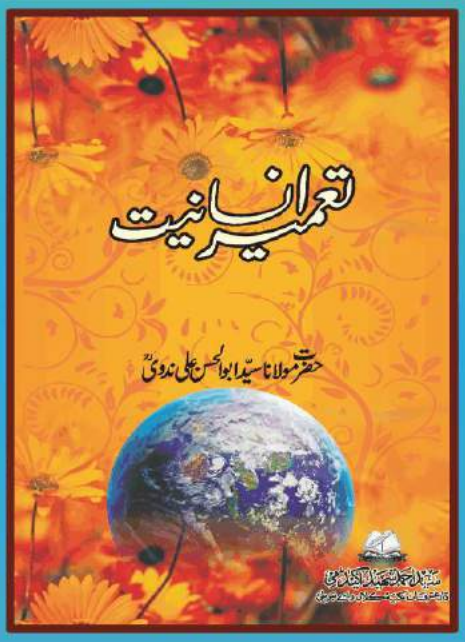

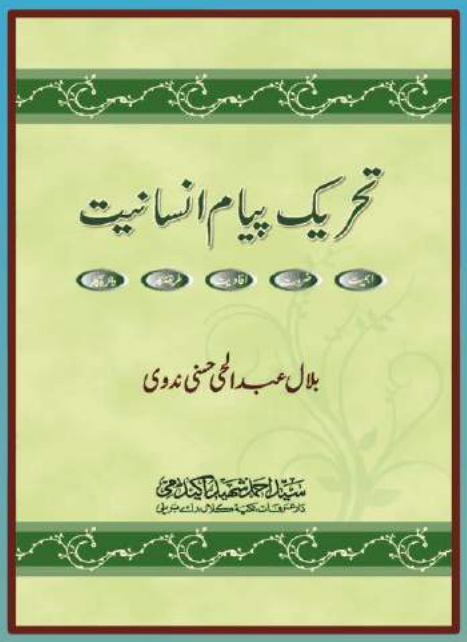

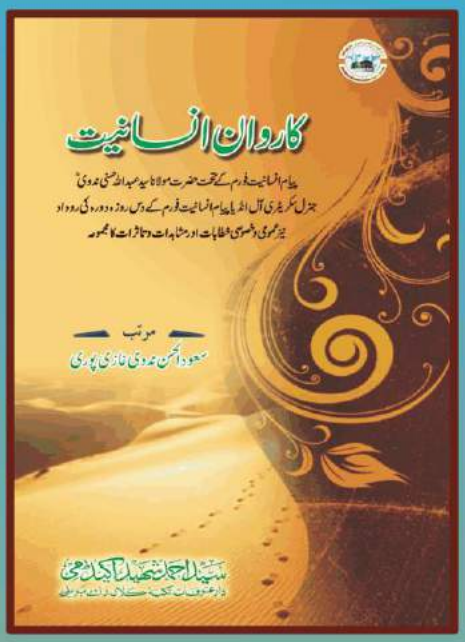

Editor: Bilal Abdul Hai Hasani Nadwi
MARKAZUL IMAM ABIL HASAN AL-NADWI
E-Mail: markazulimam@gmail.com - Dare Arafat, Takiya Kalan, Raebareli (U.P.) 229001 - Mobile: 9565271812
Printed & Published by: Mohammad Hasan Nadwi, On Behalf of Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi.
Printed at S.A. Offset Printers, masjid ke Peeche, Phatak Abdullah Khan, Sabzi Mandi, Station Road, Raebareli (U.P.)